صرف شاعرات

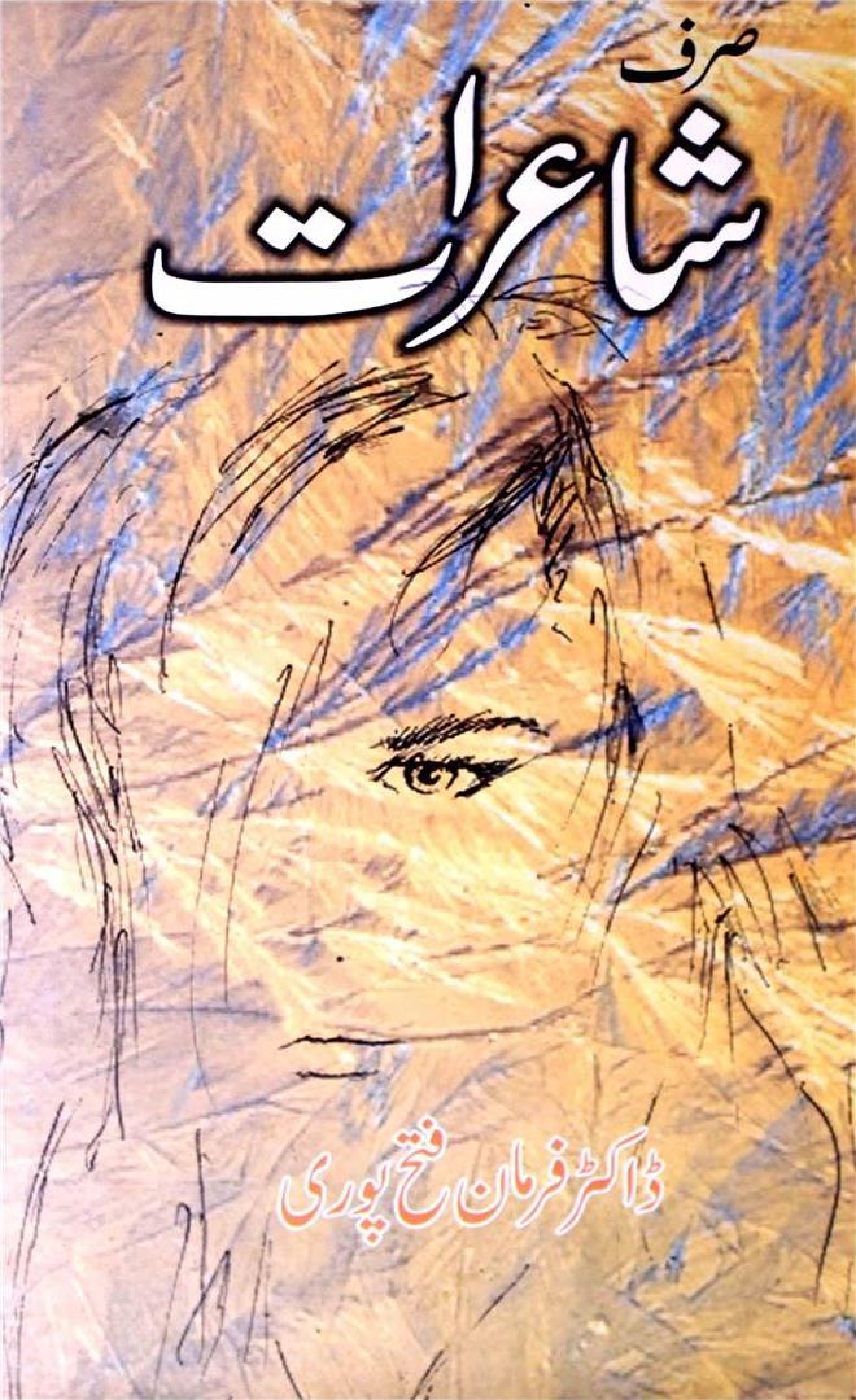

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

صرف شاعرات

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

(ستارۂ امتیاز)

الوقار پبلی کیشنز
335-K2 Wapda Town, Lahore.

جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ ہیں

ناشر :	سید وقار معین
	0300-8408750
	0321-8408750
	042-5189691-92
سال اشاعت :	2009ء
طابع :	گنج شکر پریس، لاہور
قیمت :	395/- روپے

انتساب

دنیا کی قدیم ترین نامور یونانی شاعرہ

سیفو

کے

نام

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
۶	کتاب سے پہلے ڈاکٹر فرمان فتح پوری	
۱۰	ادا جعفری...... آج کی شاعری کا ایک معتبر نام	۱۔
۳۲	برجیس طلعت نظامی کی شاعری پر سرسری نظر	۲۔
۳۴	بینا حسن...... جاگتے ہوئے احساس کی شاعرہ	۳۔
۳۸	پروین جاوید...... کیف پرور نعتوں کی امین	۴۔
۴۳	پروین نظیر سومرو اور ''بے صدا دریچے''	۵۔
۴۷	تسنیم فاطمہ اور اُن کی شاعری	۶۔
۶۰	ثروت سلطانہ...... اجتماعی سوچ کی شاعرہ	۷۔
۶۳	حمیرا رحمان کے شعری مجموعے ''اندمال'' پر ایک نظر	۸۔
۶۸	رابعہ بنتِ کعب...... فارسی کی پہلی شاعرہ	۹۔
۷۶	رشیدہ سلیم سیمیں کی شاعری	۱۰۔
۷۸	رشیدہ عیاں...... ایک قادرالکلام شاعرہ	۱۱۔
۸۲	ریحانہ روحی کے شعری مجموعے ''اور میں تنہا بہت'' پر سرسری نظر	۱۲۔
۸۶	ز۔خ۔ش۔ اردو کی پہلی انقلابی شاعرہ	۱۳۔
۹۰	سعدیہ روشن صدیقی...... روشن مستقبل کی شاعرہ	۱۴۔
۹۴	سحر علی...... باحوصلہ شاعرہ	۱۵۔
۹۶	شاہدہ حسن...... حرارت و حرکت اور روشنی کی پیامبر	۱۶۔
۹۹	صادقہ فاطمی کا شعری مجموعہ ''دھڑکن''	۱۷۔

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
۱۰۵	صالحہ کوثر اور تسنیم کی شاعری	۱۸۔
۱۰۸	صبیحہ صباء، فکر و جذبے کے امتزاج کی شاعرہ	۱۹۔
۱۱۴	عرفانہ عزیز کی شاعری	۲۰۔
۱۱۸	غزالہ خاکوانی کی شاعری	۲۱۔
۱۲۰	فاطمہ قیصری ریحانہ کی متصوفانہ شاعری	۲۲۔
۱۲۳	فرخ خیالی کا شعری مجموعہ...... ''نینداب نہیں آتی'' پر سرسری نظر	۲۳۔
۱۲۸	کنیز فاطمہ کرن...... ''زرگل'' کی شاعرہ	۲۴۔
۱۳۲	گلنار آفریں...... دردمند دل شاعرہ	۲۵۔
۱۳۹	ماہ لقا چندا بائی...... کلاسیکی شاعری کا معتبر نام	۲۶۔
۱۴۱	مخفی امروہوی...... ''متاعِ مخفی'' کی روشنی میں	۲۷۔
۱۴۴	نجمہ عثمان...... روشن خیال شاعرہ	۲۸۔
۱۴۹	نسیم سید...... کرب، احساس اور رجائی نقطہ نظر کی شاعرہ	۲۹۔
۱۵۴	نسیم کلثوم...... غمِ نشاط کی شاعرہ	۳۰۔
۱۵۹	نوشی گیلانی...... حوصلہ مند شاعرہ	۳۱۔
۱۶۳	وحیدہ نسیم اور اُن کی شاعری	۳۲۔
۱۶۶	یاسمین گل کی شاعری	۳۳۔
	ضمیمہ شاعرات کے دو قدیم تذکرے	۳۴۔
۱۷۱	۱۔ بہارستانِ ناز	
۱۷۸	۲۔ چمن انداز	

کتاب سے پہلے

شاعری کے حوالے سے اُردو ادب کی تاریخ میں خواتین کی شرکت اگرچہ شروع ہی سے رہی ہے۔ لیکن پدری معاشرے کا دباؤ مشرق پر کچھ اس انداز کا رہا ہے کہ خواتین کو بحیثیت شاعرہ پوری طرح اُبھر کر سامنے آنے کا موقع نہیں ملا، ہر چند کہ شاعرات کے متعدد تذکرے بھی انیسویں صدی میں لکھے گئے اور شاعرات کی تعداد بھی سینکڑوں میں ظاہر کی گئی لیکن کسی ایک شاعرہ کو بھی میدانِ سخن میں مردوں کی ہم سر و حریف بن کر نمایاں ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ لائق سے لائق شاعرہ کو بھی کبھی کسبی کہہ کر، کبھی طوائف کا نام دے کر، کبھی شاعر کے بجائے متشاعرہ ٹھہرا کر اور کبھی مرد شاعر کی خوشہ چین و پروردہ قرار دے کر اسے کم رتبہ و بے توقیر ثابت کیا گیا۔

انیسویں صدی کے اختتام تک یہی صورت رہی البتہ بیسویں صدی کے نصف اوّل میں جدید تعلیم اور قومی تحریکوں کے زیر اثر چند خواتین اپنے معاشرے کی مہمل بندشوں کو توڑ کر آگے بڑھیں۔ سب پہلے ایک معتبر و انقلابی شاعرہ کی حیثیت سے (ز۔خ۔ش) زاہدہ خاتون شروانی سامنے آئیں۔ پھر ادا جعفری نے قدم جمایا بعد ازاں دیگر شاعرات سامنے آتی گئیں اور کارواں بنتا گیا۔

بیسویں صدی کے نصف دوم کے آغاز سے پہلے یعنی ۱۹۵۰ء سے پہلے خواتین اہل قلم نے ایک بڑے قافلے کی صورت اختیار کر لی اور اس نے اُردو شاعری، اردو افسانہ، ناول، تحقیق اور تنقید سب کو اپنے حصار میں لے لیا۔

اُوپر جو باتیں، خواتین شعراء کے حوالے سے کی گئی ہیں، ان کا تعلق صرف اُردو

شاعری سے تھا لیکن دنیا کی مختلف زبانوں کی شعری تاریخ پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ صنفِ نازک نے روزِ اوّل ہی سے مردوں کے دوش بدوش شعر کی تخلیق میں حصہ لیا۔ عالمی ادب کی تاریخ میں خواتین کی شاعری کے حوالے سے جو قدیم ترین نام ملتا ہے وہ سیفو Sapho کا ہے۔ سیفو یونانی شاعرہ ہے، کئی صدی قبل مسیح سے اس کا نام شاعری کی تاریخ میں ملتا ہے۔ افلاطون اور ارسطو دونوں نے اس کی تخلیقی صلاحیتوں کی داد دی ہے اور اسے وہبی قوتوں کی شاعرہ تسلیم کیا ہے۔ بلکہ قدامت کے اعتبار سے عورتوں کا نام، مردوں سے پہلے آتا ہے۔ اس کے ثبوت میں عالمی تاریخِ شاعری میں درجنوں مثالیں مل جائیں گی خود اس کتاب میں ایک مثال رابعہ بنتِ کعب کے نام سے موجود ہے یہ فارسی کی پہلی شاعرہ ہے اور نہ صرف فارسی ادب بلکہ دوسری زبانوں کے حوالے سے بہت اہم خیال کی جاتی ہیں۔

یہی صورت، ترکی زبان کی ایک مشہور شاعرہ، نگار بنتِ عثمان کی ہے۔ نگار بنت عثمان انیسویں صدی عیسوی کی ایک نامور شاعرہ ہے، نہ صرف شاعرہ بلکہ عالمِ زبان اور اسکالر ہے۔ اس کے دواوین اور مختلف علوم وفنون پر اس کے نثری مجموعے موجود ہیں اور ترکی زبان وادب کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کے مالک ہیں۔ علامہ نیاز فتح پوری نے نگار بنتِ عثمان ہی کی شہرت ومقبولیت سے متاثر ہو کر اپنے اُردو ماہنامہ کا نام ''نگار'' رکھا تھا۔ نگار ۱۹۲۲ء سے آج تک مسلسل نکل رہا ہے۔ ملتان یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر انوار احمد نے، اس ترکی شاعرہ کے بارے میں ایک بہت مفصل اور عالمانہ مقالہ، نیاز یادگاری لیکچر کے ایک جلسے میں پڑھا تھا۔ اُن کا یہ مقالہ نگار میں شائع بھی ہو چکا ہے۔

برصغیر کی قدیم زبانوں کے حوالے سے میرا بائی کا نام بھی اس جگہ قابل ذکر ہے۔ میرا بائی بارہویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتی ہے اور اُس نے قدیم ہندی خصوصاً اودھی

زبان میں بہت قیمتی اثاثہ یادگار چھوڑا ہے۔ میرابائی کا نام اُودھی اور ہندی کے مشہور ترین شعرا مثلِ تلسی داس، کبیر داس، سورداس، بھوشن اور عبدالرحیم خانخانان (رحمٰن) کے نام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اس کا یہ دوہا

کا گا سب تن کھائیو، چن چن کھائیو ماس
دو نینا مت کھائیو، پیا ملن کی آس

زبانِ زدِ خلائق ہے۔

مختصراً کہنا یہ مقصود ہے کہ مردوں کے دوش بدوش، ہر زبان میں عورتوں نے بھی شعر و ادب کی ترقی میں برابر کا حصّہ لیا ہے اور اُردو زبان بھی اس سلسلے میں مالا مال ہے ضرورت یہ ہے کہ اُن کی طرف خاطر خواہ توجہ دی جائے۔ مجھے یقین ہے کہ زیرِ نظر ''کتاب شاعرات ہی شاعرات''، اس سلسلے میں اہم قدم اور راہنما ثابت ہوگی۔

اس کتاب کے مطالعے کے وقت یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ یہ کوئی بلند پایہ تحقیقی کام نہیں ہے۔ اس میں تاریخی یا زمانی تسلسل کی تلاش مناسب نہ ہوگی۔ اس کتاب میں مذکورہ شاعرات کا ذکر، ان کے ناموں کو بلحاظ حروف تہجی مرتب کیا گیا ہے۔ یہ ذکر بھی بہت ناہموار ہے، کہیں بہت مختصر، کہیں اوسط، کہیں قدرے طویل اور دو چار کا ذکر ایک مکمل مضمون کی شکل میں ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ جتنی شاعرات کا کلام میری نظر سے گزرا ہے، ان کے بارے میں میری رائے جگہ پا جائے یہ رائیں کہیں کسی فلیپ میں چھپی تھیں، کہیں کسی تبصرے میں، کہیں کسی تعارفی مضمون میں، اور کہیں اخباری کالموں میں، ان کی تلاش اور یکجائی کا کام بھی میرے لئے بہت مشکل تھا لیکن برادرم سید محمد اصغر کاظمی نے اس مشکل کو آسان کر دیا اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ اگر سید محمد اصغر کاظمی صاحب اس طرف

توجہ نہ کرتے اور مجھ سے اصرار کر کے ان آراء کو مربوط صورت میں لانے کے مسلسل تقاضے نہ کرتے رہتے تو یہ کام نہ تو تکمیل کو پہنچتا اور نہ کتابی شکل میں منظر عام پر آ سکتا تھا۔ میں اصغر کاظمی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے خواتین شعراء کے بارے میں میری منتشر تحریروں کو یکجا کر کے محفوظ کیا اور مجھ سے اس پر بہت کچھ لکھوالیا، اتنا کچھ کہ کتاب بن گئی۔ ساتھ ہی یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ اس کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ و نمونہ اُردو شاعرات کے دو تذکروں کا ذکر قدرے تفصیل سے کر دیا گیا ہے۔ تا کہ یہ ثابت ہو سکے کہ خواتین نے اُردو شاعری کے تاریخی دھارے میں شامل رہنے کی روزِ اوّل سے ہی کوشش کی ہے۔

ادا جعفری، آج کی شاعری کا ایک معتبر نام

ادا جعفری عہد حاضر کی ان شاعروں میں سے ہیں جن کا شمار بہ اعتبار طویل مشق سخن اور ریاضت فن، صف اوّل کے معتبر شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ آج سے نہیں کم وبیش چالیس پینتالیس سال سے شعر کہہ رہی ہیں۔ گاہے گاہے یا بطور تفریح نہیں بلکہ تواتر وکمال احتیاط کے ساتھ کہہ رہی ہیں۔ جو کچھ کہہ رہی ہیں شعور حیات اور دلاویزی فن کے سائے میں کہہ رہی ہیں۔ محسوسات و جذبات کے اسی ارتعاش کے ساتھ کہہ رہی ہیں جس کی بدولت آج سے پچیس تیس سال پہلے بھی ان کا شعر پہچان لیا جاتا تھا۔ خصوصیت سے قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو آرائش خم کاکل کے لئے نہیں اندیشہ ہائے دورو دراز کے لئے صرف کررہی ہیں۔ شعر گوئی کو وقت گزاری کے مشغلے کے طور پر نہیں، بلکہ فریضہ وعبادت جان کر اپنائے ہوئے ہیں۔ صلہ وستائش کے لئے نہیں خود کو عذاب آگہی سے نجات دلانے کیلئے مسلسل لکھے جارہی ہیں اور اس انداز سے لکھے جارہی ہیں کہ شعر و ادب کے باشعور وسنجیدہ قاری کے مطالعے اور گفتگو کا موضوع بنی ہوئی ہیں۔ لیکن یہ مقامِ امتیاز انہیں آسانی سے ہاتھ نہیں آیا۔ اس منزل تک پہنچنے کیلئے ادا جعفری کو بڑے کٹھن مرحلوں سے گزرنا پڑا ہے اور دیدہ ودل پر بے شمار عذاب سہنے پڑے ہیں۔ چنانچہ اثر لکھنوی کے لفظوں میں اگر وہ یہ کہیں کہ

میں نے رو رو کے رات کاٹی ہے
آنسوؤں پر یہ رنگ تب آیا ہے

تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

بات یہ ہے کہ ادا جعفری کی سخن سرائی کا آغاز ترقی پسند تحریک کے دورِ شباب کے بعد دوسری جنگ عظیم کی بھونچالی فضا اور پاک و ہند کی تحریک آزادی کے پُر آشوب ماحول میں ہوتا ہے۔ یہ فضا بیسویں صدی کی پانچوں دہائی یعنی ۱۹۴۰ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیانی عرصے سے خاص تعلق رکھتی ہے۔ یہ دہائی جس میں ادا جعفری، شباب و ریحان شباب کی وادیوں کی سفیر رہی ہوں گی، سیاسی و سماجی اور شعری و ادبی، ہر لحاظ سے پُر شور و ہنگامہ خیز دہائی تھی۔ قومی و بین الاقوامی دونوں سطح پر ایک بھیانک بے اطمینانی اور انتشار کا عالم طاری تھا۔ قومی سطح پر صورتِ حال یہ تھی کہ ایک طرف برعظیم میں برطانوی سامراج سے نجات پانے کی آخری جنگ لڑی جارہی تھی، دوسری طرف تحریکِ پاکستان کے تحت ہندوستان کی تقسیم اور مسلمانانِ ہند کے تہذیبی تحفظ کا مسئلہ نہایت سنگین صورت اختیار کر گیا تھا۔ آزادی کے بعد برعظیم کی قومی زبان کیا ہوگی، ہندی یا اردو؟

یہ سوال ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ اتنی شدت سے زیرِ بحث آیا کہ کانگریس و مسلم لیگ کی مفاہمت کے راستے کا بھاری پتھر بن گیا۔ اس پتھر کو ہٹانے کیلئے کیا کچھ نہ کیا گیا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے نامزد ارکان پر مشتمل کمیشن قائم کئے گئے۔ ہندی اردو کے مصنفین کی مشترکہ کانفرنسیں منعقد ہوئیں، مفاہمتی فارمولے تیار کئے گئے، وعدے اور معاہدے ہوئے، ایک معاہدہ ''بابو راجندر پرشاد اور مولوی عبدالحق معاہدہ'' کے نام سے سامنے آیا تھی کہ اردو کا نام بدل کر ہندوستانی رکھ دیا گیا لیکن مہاتما گاندھی اور کانگریس نے اکثریتی طاقت کے زعم میں سارے معاہدوں اور فیصلوں کو بے معنی قرار دے دیا۔ سیاسی مفاہمت کا دروازہ ہمیشہ کیلئے بند ہو گیا اور تحریکِ آزادی آخر کار ہندوستان کی تقسیم و قیامِ پاکستان پر منتج ہوئی۔

گرد و پیش کی اس سیاسی شوریدگی سے قطع نظر بین الاقوامی سطح پر کیفیت یہ تھی کہ آمریت و سامراجی استبداد کے خلاف ہر طرف سے آواز بلند ہو رہی تھی۔ مشرق میں چین، مدت کے بعد ایک عظیم آزاد مملکت کے روپ میں گلوب پر نمودار ہو رہا تھا۔ مغرب میں برطانیہ کا کبھی نہ ڈوبنے والا سورج تیزی سے اپنی بساط کو سمیٹنے میں لگا تھا۔ ہیروشیما کی تباہی نے یقین دلا دیا تھا کہ صنعتی تہذیب اور جدید سائنسی ایجادات، جسم و جان کیلئے نفع بخش ہونے کے ساتھ ساتھ حد درجہ مہلک اور جان لیوا بھی ہو سکتی ہیں۔ ایٹمی ہتھیار رکھنے والی قومیں نہ صرف یہ کہ کسی وقت بھی چھوٹی قوموں کی آزادی سلب کر سکتی ہیں بلکہ بہت آسانی سے انہیں موت کے گھاٹ بھی اتار سکتی ہیں۔ بجلی کا وہ ایک بٹن جسے روشنی کا منبع خیال کیا جاتا ہے پل بھر میں پوری دنیا کو خاک وخوں کے ڈھیر میں بدل سکتا ہے۔

اس سیاسی وسماجی ہل چل اور خوف زدگی نے جہاں زندگی کے دوسرے مسائل کے بارے میں غور وفکر کے نئے دریچے کھول دیئے تھے وہاں ادب و زندگی کے رائج الوقت رشتوں اور عقیدوں پر نظرِ ثانی کیلئے بھی آدمی کو مجبور کر دیا تھا۔ ترقی پسند تحریک کا واضح میلان ابتدا میں اشتراکیت و اشتمالیت کی طرف تھا اور اس کے نزدیک حقیقی ادب صرف وہ تھا جو خاص قسم کے سیاسی وسماجی نظام کے تابع ہو۔ لیکن پانچویں دہائی کے بدلتے ہوئے حالات میں اس تحریک کے موقف میں تبدیلی رونما ہوئی۔ ترمیم و تنسیخ اور تجدید و تعدیل کا عمل شروع ہوا اور انتہا پسند و اعتدال پسند کے عنوان سے ادیبوں اور شاعروں کے دو دھڑے واضح شکل میں نظر آنے لگے۔ ن۔م۔ راشد اور میراجی کی شاعری جسے بعض حلقوں نے ذہنی تعیش اور ذہنی تلذذ کا نام دے کر مہمل قرار دے دیا تھا، قابل توجہ سمجھی جانے لگی تھی۔ غزل کے خلاف بھی شور وغوغا بہت کم ہو گیا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مشاعروں کی معرفت جگر مرادآبادی

کی قیادت میں اردو غزل از سر نو قبول عام کے منصب پر فائز ہو رہی تھی۔ دوسری طرف مقفیٰ و پابند نظم کے ساتھ ساتھ جدید نظم، معریٰ و آزاد دونوں صورتوں میں اپنے قدم جما رہی تھی۔ فلموں کے حوالے سے اردو گیت صرف عوام الناس کو نہیں خاص الخاص کو بھی اپنی طرف کھینچنے لگے تھے۔ جوش کی سیاسی، اختر شیرانی کی رومانی، احسان دانش کی سماجی اور حفیظ کی اسلامی و تاریخی نظمیں بہت پہلے سے شعری افق پر چھائی ہوئی تھیں اور کچھ اس انداز سے کہ ان کے اثر سے نئی نسل کے شاعروں کا بچ نکلنا آسان نہ تھا۔ علامہ اقبال اگرچہ حیات نہ تھے لیکن ان کی شاعری کا سایہ اس دور کی پوری شاعری کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھا۔ مختصر یہ کہ ۱۹۴۰ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیان ادا جعفری نے بحیثیت شاعر جس فضا میں آنکھ کھولی اس میں ایک دو نہیں درجنوں اسالیب شعری و نظریات حیات پرورش پا رہے تھے اور اس فضائے خاص میں گونجی ہوئے ہر صدائے شعری نئے کہنے والوں سے یوں مخاطب تھی کہ:

اے واردان تازہ بساط ہوائے دل
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

ایسے میں کسی نئے شاعر کا سر اُبھارنا اور فضا میں گونجی ہوئی صداؤں کے جال سے نکل کر اپنی آواز کو خود اعتمادی کے ساتھ بلند کرنا آسان نہ تھا۔ جن مشکلات کا ذکر ابھی اُوپر کیا گیا ان سے بھی بڑی ایک مشکل یہ تھی کہ یہ عہد بہ اعتبار سنجیدہ مقبولیت حقیقتاً فراق، فیض اور اختر الایمان کا دور تھا۔ ان کی مقبولیت میں مشاعروں کے شاعر کی مقبولیت جیسا خروش نہیں بلکہ سمندروں جیسی گہرائی تھی۔ ان تینوں کی انفرادیت شروع سے آخر تک یکساں نمایاں رہی اور تینوں نے پُر اسرار طور پر شعر و ادب کے باشعور و سنجیدہ قاری کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ انہیں کے دوش بدوش مجید امجد، مجروح، ساغر، عدم، مجاز، جذبی، احمد ندیم

قاسمی، ساحر اور سردار جعفری وغیرہ کی آوازیں بھی کچھ کم پُرکشش نہ تھیں۔ ان میں سے ہر ایک نے ایسا رنگ جمالیا تھا کہ بعد کے شعراء کا ان کی تقلید یا اثر سے خود کو بچالے جانا بہت مشکل تھا۔ مشاہدہ و مطالعہ بتاتا ہے کہ بہت سے نئے لکھنے والے ان کے ہاتھوں مارے گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اعلیٰ درجے کی تخلیقی صلاحیتوں کے باوصف ہر مقبول عام اسلوب شعری کی پیروی کی کوشش کرتے رہے۔ اس کوشش میں بھی ان کا عالم، غالب کے لفظوں میں یوں رہا کہ:

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

نتیجتاً تقلید بے رنگ اور پیروی بے ثبات کا شکار ہو کر رہ گئے لیکن ادا جعفری کا کمال یہ ہے کہ وہ بعض دوسروں کی طرح سب سے کسب فیض کرنے کے باوجود اپنے آپ کو غیر مستحسن اور تقلید و اثر سے بچالے گئیں۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا اس کامیابی تک رسائی حاصل کرنے میں ادا جعفری کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، وہ اپنے راستے کی تلاش میں برسوں سرگرداں رہی ہیں۔ شعر گوئی کے ابتدائی زمانے میں کئی سوالیہ نشان اور کئی نشانِ راہ ان کے سامنے رہے ہیں۔ کس سوالیہ نشان کا جواب دیں اور کس نشانِ راہ کو راہبر بنائیں! کس سازِ حیات کے تاروں کو چھیڑیں اور کس کو نظر انداز کریں! کس کی شاعرانہ لے کے اثر کو زائل کریں اور کس کے طرزِ سخن سے استفادے کی صورت نکالیں! آس پاس بکھرے ہوئے ہزار رنگوں میں سے کس کو ہاتھ لگائیں اور کس رنگ سے بے نیازانہ گزر جائیں۔ کوئی رنگ پوری طرح جی کو بھائے تو اس کی مدد سے اپنی پسند کا رنگ کیونکر تخلیق کریں۔ سماجی و تہذیبی زندگی کی بنتی بگڑی

قدروں میں سے کسے قبول کریں اور کسے مردود ٹھہرائیں! شعر میں حسن خیال کو ترجیح دیں یا خیال حسن کو اور دونوں کو اپنائیں تو اپنائیں کیوں کر؟ اس قسم کے اور نہ جانے کتنے سوالات تھے جو ادا جعفری کے ذہن کو برسوں الجھن میں ڈالے رہے۔ چنانچہ ۱۹۴۰ء و ۱۹۵۰ء کے درمیانی عرصے میں وہ کبھی جادے کی تلاش میں رہیں کبھی منزل کی۔ کبھی راہبر کو تکتی رہیں کبھی راستے کو۔ کبھی اپنی آنکھ سے دنیا کو دیکھتی رہیں کبھی دنیا کی آنکھ سے خود کو۔ کبھی اپنے آپ سے دست و گریباں رہیں اور کبھی اپنے گرد و پیش سے۔ کبھی کسی کو ہم راز بنانے کی کوشش کرتی رہیں اور کبھی دمساز بنانے کی۔ کبھی اپنی ذات کے خول سے نکل کر اجتماعیت میں کھو جانے کی سوچتی رہیں کبھی اجتماعیت کو اپنی ذات میں سمو لینے کی۔ کبھی زبان و بیان کی رعنائی کو سب کچھ جانتی رہیں کبھی موضوع و مواد کو۔ لیکن اس عالم تذبذب میں بھی وہ کبھی از خود رفتہ یا برافروختہ نہیں ہوئیں۔ ان پر کبھی بے دلی و مایوسی کا غلبہ نہیں چھایا۔ ہزار آفتوں کے باوجود اپنے آشوب آگہی اور کرب روحانی کے اظہار کیلئے وہ ہمہ وقت بے چین و مضطرب رہیں۔ اس بے چینی و اضطراب کا کیا عالم تھا اس کی تصویر ادا جعفری کے اولین مجموعہ کلام ''میں ساز ڈھونڈتی رہی'' مطبوعہ ۱۹۵۰ء میں آسانی سے دیکھی جا سکتی ہے۔ اس جگہ ان کی صرف ایک نظم جس کا عنوان ''کتاب کا عنوان'' بھی ہے دیکھتے چلیے:

بہار کھلکھلا اٹھی

جنوں نواز بدلیوں کی چھاؤں میں

ہر ایک شاخ لالہ زار سجدہ ریز ہو گئی

ہوائے مرغزار گنگنا اٹھی

جنوں نوازیاں بڑھیں

فسانہ سازیاں بڑھیں ۔

مگر بہار کو ابھی تک آرزوئے نغمہ تھی

شہید کیف انتظار و جستجوئے نغمہ تھی

میں ساز ڈھونڈنے لگی

میں ساز ڈھونڈنے لگی

میں محو جستجو رہی

مجھے وہ ساز دلنواز آج تک نہ مل سکا

وہ اودی اودی بدلیاں کہ فخر صد بہار تھیں

فلک کی چشم خوں فشاں سے اشک بن کر ڈھل گئیں

زمین پہ شعلہ باریاں، فلک پر گڑ گڑاہٹیں

کہ سُن رہے ہیں چشم و دل، نظام نو کی آہٹیں

بہار بیت ہی چکی خزاں بھی بیت جائے گی

مگر میں ایک سوچ میں پڑی ہوئی ہوں آج بھی

وہ میری آرزو کی ناؤ کھے سکے گا یا نہیں

نظام نو بھی مجھ کو ساز دے سکے گا یا نہیں؟

(میں ساز ڈھونڈتی رہی)

اس نظم میں یا اس مجموعے کی دوسری نظموں اور غزلوں میں، کسی پختہ کار ذہن و تخیل کے ان تہ داریوں اور بلندیوں کی تلاش، جن کی نمائندگی ادا جعفری کے بعد کے مجموعے خصوصاً ان کا چوتھا مجموعہ شعری ''ساز سخن بہانا ہے'' کرنا نامناسب ہوگی۔ ''میں ساز

ڈھونڈتی رہی'' کے مطالعے کے وقت یہ بات بہر حال یاد رکھنی چاہئے کہ یہ ایک جواں سال ونو جوان شاعر کا مجموعہ کلام ہے۔ اس نظم میں اور اس مجموعے کی دوسری غزلیات ومنظومات میں فکر وشعور کی پرچھائیاں بہت صاف نظر نہیں آتیں۔ البتہ حسن ونغمہ کی ہر صدا پر لبیک کہنے کی آرزو، زندگی کو محبت اور صرف محبت کی اساس پر استوار کرنے کی تڑپ، کسی کو چاہنے اور خود کو چاہے جانے کی خواہش، زندگی کے جمالیاتی اور انقلاب بدوش ورومانی پہلوؤں سے فطری لگاؤ بہت سی بے نام اور انجانی اُمنگوں اور آرزوؤں کی ہل چل، جذبات میں شدت و گرمی، محسوسات میں لطافت ونرمی، تخیل ورنگینی ورندی، سوچ میں سنجیدگی وپاکیزگی، ذہن میں کچھ کر گزرنے کا خیال اور دل میں گردو پیش کو خوشگوار وخوبصورت بنا دینے کی تمنائے بے نام۔ ہر لمحہ و ہر لحظہ خوب سے خوب تر کی تلاش، تیرگی کو روشنی اور جبر کو اختیار میں بدل دینے کا اشتیاق، ظلم واستبداد کے خلاف بے خروش احتجاج اور روش عام سے انحراف، زندگی کی مردہ ونا کارہ روایتوں سے بغاوت اور نامساعد حالات سے مزاحمت ومقاومت، فطرت وحسن کے مطالعے کا ذوق اور اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا شوق ایسی باتیں ہیں جن کی کسی بھی ہونہار و باشعور نو جوان شاعر سے بجا طور پر توقع کی جاسکتی ہے اور یہ ساری باتیں ادا جعفری کے پہلے مجموعہ کلام میں موجود ہیں۔ قاضی عبدالغفار نے آج سے تقریباً چالیس سال پہلے ۱۹۴۷ء کے آغاز میں ''میں ساز ڈھونڈتی رہی'' کے حوالے سے بہت صحیح لکھا تھا کہ:

''ان کے کلام میں قدیم اور فرسودہ نظام زندگی کے خلاف بغاوت کا ایک بے پناہ جذبہ کارفرما ہے ان کی آواز سراپا طلب اور احتجاج ہے۔ ان کے اندازِ بیان سے ایک ایسی قوت ارادی مترشح ہے جس کے بغیر جدید ادب کے کسی معمار کا پیام موثر نہیں ہوسکتا''۔

۱۹۶۷ء میں ادا جعفری کا دوسرا شعری مجموعہ ''شہر درد'' منظر عام پر آیا۔ اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۵۰ء تک زندگی کے شب کدے میں ادا جعفری کو جس نور کی تلاش تھی وہ نور انہیں مل گیا ہے اور اس نور نے ان کی بساط جسم و جان پر بہت خوشگوار اثر ڈالا ہے۔ خواب و خیال کی دھندلی لکیروں کی جگہ یقین و طمانیت کے روشن نقوش اُبھار دیئے ہیں۔ زندگی کی راہوں میں اُمید کی چاندنی چھٹکا دی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے دوپہر کی کڑی دھوپ میں چلنے والے تھکے ماندے مسافر کو دیوار کا سایہ میسر آ گیا ہے۔ اس دیوار کے سائے میں ادا جعفری کی زندگی میں بہت نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ داخلی دنیا کے ہنگاموں میں ٹھہراؤ آیا ہے اور خارجی دنیا پر تازہ اُمنگوں کے ساتھ جرات مندانہ نگاہ ڈالنے کا حوصلہ پیدا ہوا ہے۔ اب ان کے لئے زندگی کی کوئی خوشی یا غم محض ذاتی یا محض کائناتی نہیں رہا بلکہ دونوں ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہو گئے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ یوں کہنا چاہئے کہ ذات و کائنات میں وہ دوئی جس نے ۱۹۵۰ء سے کچھ پہلے تک ان کے دروں خانہ جاں میں تضاد و تصادم کی ایک کرب آلود فضا پیدا کر رکھی تھی اب وہ باقی نہیں رہی۔ پہلے ان کی نظر صرف ماضی و حال پر مرکوز تھی، اب ان سے آگے بڑھ کر مستقبل کو خوش آئند بنانے اور نژادِ نو کو زندگی کی تازہ بشارتوں سے ہمکنار کرنے کی جستجو میں ہے۔ بقول ادا جعفری

میری آغوش میں یہ مہکتا ہوا چاند فردا کے خوابوں کی تعبیر ہے
یہ نئی نسل کے حوصلوں کا امیں آنے والے زمانے کی تقدیر ہے

یہ خواب کشاں کشاں انہیں ایک نئے موڑ پر لے آیا۔ پہلے وہ صرف درد آشنا تھیں اب شہر درد کے بیچوں بیچ آ بسیں لیکن یہ ''شہر درد'' چونکہ امیر و غریب، عام و خاص،

محبوب ومحبّ اور اپنے اور پرائے سب کا ہے اس لئے مرگ انبوہ جشن دارد کے مصداق ہے۔ ہر چند کہ اس کی وسعتیں ان کی وحشت جاں کیلئے صحرا جیسی سازگار تو نہیں تاہم فرزانگی کو شرمسار کرنے اور پائے جنوں کو جنبش میں لانے کیلئے بہت ہیں۔ لیکن ادا جعفری ابھی ان میٹھے خوابوں کا پوری طرح لطف بھی نہ لے سکیں تھیں کہ ۱۹۶۵ء میں پاکستان پر بھارتی حملے نے انہیں دفعتہً چونکا دیا۔ آنکھیں بے خواب ہو کر رہ گئیں۔ سارے سپنے بکھر گئے سانس کی جس آمد وشد کو انہوں نے دم عیسیٰ جانا تھا وہ بارود کی بو ثابت ہوئی۔ وطن کی سوندھی مٹی اور اس کی ہریالی نے تقدس وفا اور عفت و ناموس حیات کی خاطر از سرنو انہیں آواز دی اور خاک وخوں کے بگولوں نے ادا جعفری کو ایک اذیت ناک ''شہر درد'' میں پہنچا دیا۔ اب یہ ''شہر درد'' ان کیلئے کسی نوعمر یا جواں سال الھڑ لڑکی کے رومان پرور خیالوں کی جولان گاہ نہ تھا بلکہ ایک سلیقہ شعار بیوی، ایک حوصلہ مند ماں، ایک مہذب مشرقی خاتون اور ایک ذی شعور ذمہ دار شہری کے غور وفکر کے لئے ایک تازہ جہان معنی تھا۔ یہ شہر درد یا جہان معنی ادا جعفری پر کس طرح اثر انداز ہوا ہے اس کا اندازہ کرنے کیلئے کم از کم ان کی دو نظمیں ضرور دیکھنی چاہئیں۔ ایک ''ماں'' دوسری ''سترہ دن'' پہلی ۱۹۶۶ء میں کہی گئی ہے دوسری ۱۹۶۵ء میں۔ یہ دونوں نظمیں ادا جعفری اور شہر درد کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ اس لئے ہر ایک کے چند اشعار پر نگاہ ڈالتے چلئے:

یہ دھواں ہے کہ مرے دل کی لگی ہے؟ کیا ہے؟
میری آنکھیں ہیں کہ ساون کی جھڑی ہے؟ کیا ہے؟
وہ اندھیرا ہے کہ دم میرا گھٹا جاتا ہے
آگے کچھ دیکھنا چاہوں بھی تو وہم آتا ہے

میں کہ تقدیس وفا، عفت و ناموس حیات
میرے انفاس سے روشن ہوا فانوسِ حیات
میں کسی خواب دل آویز کی تشکیل نہ تھی
جذبہ لذت تخلیق کی تکمیل نہ تھی
میں تو خود خالق و کوزہ گرو صناع بنی
شہر بانو بھی مرا نام رہا مریم بھی
رہنمائی کو میرے دل کی لگن کافی تھی
آبلہ پائی کو سینے کی چبھن کافی تھی
کوئی کونپل نئی پھوٹی تو یہ جانا میں نے
دے دیا دہر کو جینے کا سندیسا میں نے
غنچہ چٹکا تو مری روح میں نغمے جاگے
شاید اب مجھ کو میرے خواب کی تعبیر ملے
پھول کھلتا تو بہاروں کا سلام آتا تھا
مہرو مہ کا مجھے کرنوں سے پیام آتا تھا
میرا مذہب کہ محبت بھی ہے امید بھی ہے
پھر یہ کیسی مرے انداز میں محرومی ہے
گرد صدیوں کے سفر کے مرے بالوں میں آ لی
پاؤں چھلنی ہیں، نگہ زخمی ہے، دل ہے خالی
جانے کس موڑ پہ کیا چوک ہوئی ہے مجھ سے

آرزو لا کے کہاں روٹھ گئی ہے مجھ سے
میں نے جو نقش ابھارا تھا وہ ایسا تو نہ تھا
میں نے شہ کار جو ڈھالا تھا وہ ایسا تو نہ تھا
آج اس سانس سے بارود کی بو آتی ہے
میں نے جس سانس کو سمجھا تھا دمِ عیسیٰ ہے
میرا طالب، مرا مطلوب کہاں آ پہنچا
میرا ارماں، مرا محبوب کہاں آ پہنچا
ایک دو کرنیں تو پھوٹی ہیں اجالے کی مگر
ان کو خورشید درخشاں تو نہیں کہہ سکتے
چند کلیوں کو بہاراں تو نہیں کہہ سکتے

(ماں)

کن تمناؤں، دعاؤں کی سحر
آج جاگی ہے اُجالے کا سندیسہ لے کر
سترہ دن کی کہانی ہمدم!
صدیاں لمحوں میں گزر جاتی ہیں قوموں کے لئے
اور کبھی ایک ہی لمحے کا فسوں
بے کراں ہوتا ہے آفاق پہ چھا جاتا ہے

قوم کو رسم و رہ درد سکھا جاتا ہے

بے حسی موت ہے، انساں کو جتا پاتا ہے

سترہ دن کی کہانی ہمدم!

فخر و ناموس وطن، میرے جواں

مائیں ہاتھوں میں اُٹھائے ہوئے قرآن بڑھیں

بہنیں دہلیز پہ ہو جانے کو قربان بڑھیں

حسن مغرور نے چپکے سے بڑھائے زیور

اور بچوں نے کیا اپنے سپاہی کو سلام

تھام لی ہاتھ میں ہر شخص نے قسمت کی زمام

پاک راہوں پہ بہا تیرا لہو، میرا لہو

یہ لہو تیرا نہ تھا، میرا نہ تھا

یہ امانت تھی زمیں کی سوز میں کو سونپی

یہ ترا عہد وفا تھا ہمدم!

یہ مرا عہد وفا تھا ہمدم!

چھائی تھی ہر سمت مگر چھٹ ہی گئی

رات بھاری مرے بیمار پہ تھی کٹ ہی گئی

اور شفق میرے شہیدوں کے لہو سے رنگیں

آج ہر ماتھے سے پھوٹی ہے اُجالے کی کرن

آج ہر شخص کو معلوم ہے جینے کا چلن

آج اشکوں پہ بھی شبنم کا گماں ہوتا ہے

آج ہر زخم پہ مرہم کا گماں ہوتا ہے

(سترہ دن)

صرف یہی نظمیں نہیں دردِ شہر (مطبوعہ ۱۹۶۷ء) کی پوری فضا، ادا جعفری کو ذات وکائنات کے رشتوں کا راز داں، زندگی وفن کا رمز آشنا اور ان کے تقاضوں کا نقیب وحلیف ثابت کرتی ہے۔ چنانچہ ایک ایک غزل اور ایک ایک نظم جذبوں کے ارتعاش کے ساتھ ساتھ تامل وتفکر کی دھوپ چھاؤں رکھتی ہے۔ کتاب کا ہر ورق پتا دیتا ہے کہ شاعر میں پختگی فن کے ساتھ توانائی فکر بھی آ گئی ہے۔ رموزِ شعر سے آشنائی کے ساتھ ساتھ مسائلِ حیات سے حریفانہ آنکھ ملانے کا سلیقہ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ اب ادا جعفری کی شاعری کی فضا سہمی سہمی یا تذبذب کی کیفیت سے کہر آلود نہیں رہی بلکہ اس میں شگفتگی وتازگی اور عزم واستقلال کے نئے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ آثار، ادا جعفری کو زندگی کی مثبت قدروں اور فن کی حقیقت پسندانہ رویوں سے والہانہ وابستگی (کامٹمنٹ) کا شاعر بناتے ہیں، وہ اپنے ذاتی حالات اور اپنے آپ سے بے نیاز رہ سکتی ہیں لیکن آس پاس کے حالات نے عام آدمی کیلئے زندگی کو جس طرح اجیرن بنا دیا ہے اور معاشرے کا ایک طاقتور طبقہ، کمزوروں کے حقوق کو جس طرح غضب کر رہا ہے وہ ان سے بے نیازانہ نہیں گزر سکتیں۔ فن کاری کی جملہ ذمہ داریوں وشرائط کے ساتھ وہ ان حالات سے نبرد آزما رہنے، ان کے خلاف آواز بلند کرنے اور احتجاج کرتے رہنے کو ایک فریضہ اور عبادت جانتی ہیں۔ چنانچہ اس فریضے کو وہ ملکی وقومی سطح پر بھی ادا کرتی نظر آتی ہیں اور اس سے بلند سطحوں پر بھی۔

شہر درد کی اشاعت پر فیض احمد فیض نے بہت صحیح کہا تھا کہ:

''ادا بدایونی جو ساز ڈھونڈتی رہی تھیں، غالباً اب ادا جعفری کو ''شہر درد'' میں ہاتھ آ گیا ہے۔ دلیل یہ ہے کہ اول تو اس مجموعے میں جگر لخت لخت کو جمع کرنے کی کسی کاوش کا پتا نہیں چلتا اور یوں گمان ہوتا ہے کہ یہ نسخہ وفا، ایک ہی مسلسل واردات کے زیر اثر خود تالیف ہو گیا ہے۔ دوسرے ادا کے لہجے میں اب ایسا تیقن اور ان کی آواز میں ایسی تمکنت ہے، جو شاعر کو جہد اظہار میں اپنا مقام ہاتھ آ جانے کے بعد ہی نصیب ہوتی ہے۔ چنانچہ ادا جعفری نے درد کا جو شہر تخلیق کیا ہے اس شہر کی دیواریں ان کی ذات تک محدود نہیں، قریب قریب عالمگیر ہیں اور اس درد میں حزن و یاس کا عنصر بہت کم ہے اور عزم و استقلال کا دخل کہیں زیادہ''۔

''شہر درد'' کے بعد ادا جعفری کی شاعری کے دو مجموعے ''غزالاں تم تو واقف ہو'' اور ''ساز سخن بہانہ ہے'' شائع ہوئے پہلا ۱۹۷۴ء میں دوسرا ۱۹۸۲ء میں۔ دونوں مجموعے عمودی اور افقی ہر اعتبار سے ادا جعفری کی تخلیق دسترس و گیرائی کے مظہر ہیں ان مجموعوں میں فنکارانہ صناعیوں کے ساتھ ساتھ عصری شعور و آگہی کا وہی تموج نظر آتا ہے جس کی ایک پختہ کار فن کار سے توقع کی جا سکتی ہے۔ یہ مجموعے مشرق کی صالح روایات کے ترجمان و پاسبان بھی ہیں اور مغرب کی مثبت اقدار حیات کے داعی و پاسدار بھی۔ ان میں طرز کہن پہ اڑنے یا آئین نو سے ڈرنے کی کیفیت کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ نہ کلاسکیت کی سخت گیری کہیں نظر آتی ہے نہ جدیدیت کی انتہا پسندی بلکہ قدیم و جدید نے ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ایک نئے اسلوبِ شعری کو جنم دیا ہے بات یہ ہے کہ حسن جہاں کہیں بھی ہو وہ ادا

جعفری کا رشتہ دار ازلی ہے۔ حسن خیال، حسن عمل اور حسن آفرینی وحسن کاری ان کی طبیعت کا انفرادی نشان اور ان کے تخلیقی مزاج کی شناخت ہیں۔ وہ اس شناخت ونشان کو اجتماعی زندگی کا نشان و شناخت بنا دینے کی متمنی ہیں۔ یہ تمنا، جدید سے پوری ہو یا قدیم سے یا دونوں کے امتزاج سے، مقصود تو زندگی کے ہنگاموں اور اندیشوں کو سہل وخوشگوار بنانا ہے۔ کلاسکیت ہو یا جدیدیت اگر زندگی کی حسن آفرینی وکارکشائی میں مددگار رہوں تو ممدوح و مسعود ورنہ ان میں سے ہر ایک مکروہ ومردود۔ زندگی اور فن کے باب میں یہی وہ نقطہ نظر اور راسخ عقیدہ ہے جو ادا جعفری کو آج سے تقریباً ڈھائی سو سال پیچھے لے گیا۔ اور انہوں نے راجہ رام نرائن موزوں کے اس شعر:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

کے ابتدائی ٹکڑے کو اپنے مجموعہ کلام کا عنوان بنایا۔ یہ شعر ادا جعفری کے ذہن میں بے سبب نہیں آیا ایک المناک تاریخی سانحہ کے تلازم خیال نے انہیں اس کی یاد دلائی ہے۔ اس شعر کے پس منظر میں، ہماری ملی تاریخ کا ایک بہت اہم واقعہ ہے اردو کے مشہور شاعر میر حسن دہلوی نے اپنے تذکرۃ الشعرائے اردو میں لکھا ہے کہ:

> ''راجہ رام نرائن، شیخ علی حزیں کے شاگرد اور فارسی کے صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ اردو میں کم کہتے تھے بلکہ نہ کہنے کے برابر کہتے تھے۔ لیکن جب سراج الدولہ کی شہادت کی خبر شہر میں پہنچی تو بے ساختہ یہ شعر نازل ہوگیا۔ شعر پڑھتے جاتے اور رو رو کر خبر لانے والوں سے خیریت پوچھتے جاتے تھے''۔

اس بیان سے سراغ لگا کہ اس شعر کا تعلق ۱۷۵۷ء میں پلاس کی جنگ آزادی اور نواب سراج الدولہ کی شکست و شہادت سے ہے یہاں ''غزالاں'' استعارہ ہے۔ سراج الدولہ کے دل شکستہ و زخم خوردہ بانکے سپاہیوں کا ''مجنوں'' اور ''دوانہ'' کے الفاظ استعارہ ہیں سراج الدولہ کا ''ویرانہ'' کا لفظ استعارہ ہے۔ عظیم آباد کی تباہی اور اس پر بیرونی سامراج کے قدم جمانے کا۔

غزالاں، مجنوں، دوانہ اور ویرانہ کے الفاظ آج بھی اردو شاعری کے زندہ استعارے ہیں لیکن ان کا جیسا خوبصورت اور اثر انگیز مصرف اُوپر کے شعر میں کیا گیا ہے کہیں اور نظر نہیں آتا۔ ہماری تاریخ اور جدوجہد آزادی کے جس منظر میں یہ شعر کہا گیا ہے اس پر نگاہ دوڑائیں تو بنگال سے لے کر کراچی تک کی یاد کچھ اس طرح تازہ ہو جائے گی کہ سقوط ڈھاکہ مشرقی پاکستان کا المناک سانحہ خود بخود ہمارے ذہنوں میں اُبھر آئے گا۔ یہی کچھ ادا جعفری کے ساتھ ہوا۔ ایک سچے پاکستانی شہری کی حیثیت سے سقوط ڈھاکہ کا سانحہ تلازم خیال کی مدد سے انہیں سراج الدولہ کی شہادت اور راجہ رام نرائن موزوں کے شعر تک لے گیا۔ فرق یہ ہے کہ راجہ رام نرائن موزوں کے مخاطب، کل کے غم زدہ وستم رسیدہ لوگ تھے اور ادا جعفری کے مخاطب، آج کے دل زدہ وغم دیدہ پاکستانی ہیں۔ ادا جعفری کا مخاطبہ ''غزالاں تم تو واقف ہو'' بہت خوبصورت وحقیقت افروز اور حد درجہ معنی خیز و دردانگیز مخاطبہ ہے۔ اس واقعہ سے پاکستانیوں پر جو کچھ بیت گئی، اس سے ہم سب خوب واقف ہیں۔ اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اگر یہ پتا لگانا چاہیں کہ ادا جعفری کی دردمند طبیعت نے بحیثیت شاعر، اس سانحے کا اثر کس طرح قبول کیا ہے تو ان کے مجموعہ کلام پر ضرور ایک نظر ڈالنی چاہئے۔ اس لئے کہ اس میں استعارہ کی صورت میں جو کچھ ہے وہ عموماً اسی خوں چکاں

حادثے کی گلکاری ہے۔ اشعار کیا ہیں۔ شاعر کے دل پر خوں کی گلابیاں ہیں جو کاغذ پر بکھری پڑی ہیں۔

اُوپر جو کچھ کہا گیا وہ کلاسیکی خوبصورت شعری رویوں سے ادا جعفری کی وابستگی کا اجمالی تذکرہ تھا۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے یہ ان کے اندازِ فکر و فن کا ایک رخ ہے ورنہ ان کے اسلوب شعری پر جتنا سایہ کلاسیکی رنگ کا ہے اس سے زیادہ گھنا سایہ جدید کا ہے۔ دونوں سائے ان کی رومانیت کے تابع رہ کر ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ادا جعفری کے رومانی مزاج کا فیضان خاص یہ ہے کہ وہ ان پر کسی عالم اور کسی رنگ میں بھی یاس و بے دلی کی کیفیت طاری نہیں ہونے دیتا۔ نیکی و بدی، تیرگی و روشنی اور طاقت و رو کمزور کے معرکوں میں وہ بڑے حوصلوں کے ساتھ، نیکی و روشنی اور کمزور کی طرف دار رہتی ہیں اور فتح مندی کو انسان کا مقدر جانتی ہیں چنانچہ جبر و ظلم کہیں اور کسی صورت میں بھی ہو، خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر، کے مصداق، ان کی درمند طبیعت خود کو جبر و ظلم کے خلاف احتجاج کرنے پر مجبور پاتی ہے۔ یہی مجبوری دراصل ان کی شاعری کا سب سے طاقتور محرک ہے۔ رسماً و تفریحاً و کجا، نجی محفلوں کیلئے طرح اور فرمائش پر بھی کچھ کہنا ان کیلئے بہت مشکل ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ دل پر چوٹ کھائے بغیر اچھا اور سچا شعر نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ ضروری نہیں کہ یہ چوٹ یکسر داخلی یا ذاتی و انفرادی نوعیت کی ہو۔ آس پاس کی خارجی زندگی کا کوئی واقعہ بھی تخلیق فن کا دل پر چوٹ لگانے اور شعر کا محرک بننے کیلئے کافی ہے۔ چنانچہ برعظیم کی تحریک آزادی ہو یا وادی کشمیر کی، حریت پسند فلسطینیوں کی جدوجہد ہو یا جنوبی افریقہ کے نہتے باسیوں کی، ۱۹۶۵ء میں پاکستان پر ہندوستان کی جارحیت ہو یا ۱۹۷۰ء کا المناک حادثہ، ہر واقعہ ادا جعفری پر اس طرح اثر انداز ہوا ہے کہ انہوں نے اپنے

آپ کو شعر گوئی پر مجبور پایا ہے۔ بلکہ اگر حقائق و واقعات کے پس منظر میں دیکھا جائے تو کہنا پڑے گا ادا جعفری نے اب تک جو کچھ کہا ہے دل و جان پر چوٹ کھانے کے بعد ہی کہا ہے۔ جبر و استبداد کے خلاف صف آرا ہو کر حق و انصاف کی مدافعت میں کہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اپنے چوتھے شعری مجموعے کا نام ''ساز سخن بہانہ ہے'' علامہ اقبال کے اس شعر

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقہ بے زمام را

سے اخذ نہ کرتیں اور ان کے مجموعہ ہائے کلام میں وہ پرسوز و دردمند فضا پیدا نہ ہو پاتی، جس کے سبب ان کی شاعری معاصرین سے الگ خیال کی جاتی ہے۔ یہ فضا ادا جعفری کی نظموں اور غزلوں میں رنگ و نور کے لحاظ سے ایک جیسی ہے لیکن نظم اور غزل کی ہیئتوں اور ان کے فنی تقاضوں کے فرق نے ان کی اثر پذیری اور گیرائی میں فرق پیدا کر دیا ہے۔ رہ گیا یہ سوال کہ ادا جعفری کی نظمیں زیادہ خوبصورت ہیں یا غزلیں۔ تو اس کا جواب بہت مشکل بھی ہے اور تفصیل طلب بھی۔ اس لئے اس مضمون میں اس بحث کو چھیڑنے کا موقع نہیں۔ البتہ اتنی بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ادا جعفری کے یہاں پہلے مجموعے سے لے کر چوتھے مجموعے تک جو کچھ ہے ہر طرح قابلِ اعتبار ہے۔ دلکشی و نظر گیر اور خیال انگیز و حیات افروز ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ فکر و فن کے نقطہ عروج کو چھوتے ہوئے بھی ارتقا پذیر ہے۔ ''ساز سخن بہانہ ہے'' یقیناً ان کا بہترین شعری مجموعہ ہے لیکن چونکہ اس میں بھی خوب سے خوب تر کی تلاش اور بہتر سے بہتر کی آرزو اسی طرح باقی ہے جیسی اس سے پہلے کے مجموعوں میں نظر آتی ہے اس لئے عین ممکن ہے کہ ان کا قدم کچھ اور آگے بڑھے اور ان کے فن کو سخن کی سطح سے اُٹھا کر ماورائے سخن کی منزل تک لے جائے۔

ادا جعفری کی شاعری کے سلسلے میں ایک اور بات قابلِ ذکر ہے۔ ادا جعفری نے زبان و بیان کے اصول وقواعد اور عروضی مسائل میں اصلاح و مشورہ کیلئے اختر شیرانی اور اثر لکھنوی کا انتخاب کیا تھا۔ یقیناً انہوں نے ان دونوں سے بہت کچھ سیکھا ہوگا لیکن عجیب بات ہے کہ ان کے شعری لب ولہجہ پر، اختر شیرانی کا کوئی اثر نظر آتا ہے نہ اثر لکھنوی کا۔ ہاں اقبال فانی اور فراق کے اثرات، ان کی شاعری میں صاف محسوس ہوتے ہیں۔ فانی سے انہوں نے غم انگیزی یا محرومی و یاس کے پہلوؤں کو نہیں لیا بلکہ ان کے فن کی پختگی، ذہن کی شائستگی اور فکر ونظر کی گہرائی کا اثر قبول کیا ہے۔ فراق سے انہوں نے ذات کے حوالے سے کائنات تک پہنچنے اور نرم و ملائم لب ولہجہ میں بات کہنے میں رہنمائی حاصل کی ہے۔ اقبال کے زیر اثر انہوں نے قومی و ملی مسائل سے محبت کرنے اور اس محبت کو شاعری کا موضوع اور محور بنانے کا گر سیکھا ہے۔ فیض کے غنائی اور مدھم لہجے کے نشانات بھی بعض جگہ ادا جعفری کے یہاں ملتے ہیں لیکن ان میں سے کسی کا اثر اتنا گہرا نہیں کہ انہیں اقبال و فانی یا فراق، فیض کا مقلد کہا جا سکے۔ ان کا کلام تقلید سے یکسر پاک ہے۔ اقبال کے طرزِ فکر سے یقیناً وہ آج تک متاثر نظر آتی ہیں لیکن ان کی شعر گوئی کا اسلوب، اقبال کے اسلوب سے بالکل جداگانہ ہے۔

یہ تو گزشتہ چالیس سال میں اردو شاعری کے اُفق پر اُبھرنے والے معتبر شاعروں کے حوالے سے ادا جعفری کی انفرادیت اور تشخص کا تذکرہ تھا۔ لیکن اردو کی خواتین شعراء کے حوالے سے بھی ان کی شاعری پر ایک نظر ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہر حال ایک خاتون شاعر ہیں۔ اس بات میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں کہ بیسویں صدی عیسوی کی ابتدائی تین دہائیوں تک اردو شاعری کی تاریخ میں کسی معتبر خاتون شاعر کا نام نظر نہیں آتا۔

میر تقی میر کا نکات الشعراء مرقومہ ۱۷۵۲ء اردو کا پہلا تذکرہ ہے۔ اس تذکرے سے لے کر محمد حسین آزاد کی مشہور تصنیف آبِ حیات مرقومہ ۱۸۸۰ء تک اردو شعراءُ کے کم وبیش ستر تذکرے لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض تذکروں میں چند خواتین شعراء کے نام بھی شامل ہیں بلکہ تین تذکرے تو ایسے ہیں جو صرف خواتین شعراء کے تراجم پر مشتمل ہیں۔ میری مراد درگا پرشاد نادر کے ''چمن انداز'' فصیح الدین رنج کے ''بہارستان ناز'' اور عبدالحی صفا بدایونی کے ''شمیم سخن'' سے ہے ان میں سے ہر ایک میں تقریباً ڈیڑھ سو شاعرات کا ذکر آیا ہے لیکن ایک نام بھی نہیں جسے صحیح معنوں میں شاعر کہا جا سکے۔

ہاں بیسویں صدی میں جب خواتین کو علم وفن کے حصول اور اظہارِ خیال کیلئے قدرے آزادی ملی تو انہیں بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع ملا۔ چنانچہ بیسویں صدی عیسوی کی چوتھی دہائی میں ادا جعفری کے ساتھ ساتھ شاعر کی حیثیت سے دو تین خواتین کے نام اور بھی نظر آتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ مقام اعتبار جو ادا جعفری کو میسر آیا ان کی ہم عصر کسی خاتون شاعر کو نہ مل سکا۔ لیکن ادا جعفری کو خاتون شاعر لکھنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان کی شاعری کے موضوعات ومحرکات کا حلقہ اثر صرف نسوانی جذبات ومحسوسات کی ترجمانی تک محدود ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ ادا جعفری نے ایک خاتون کی حیثیت سے انسانیت کے بعض ایسے نفسیاتی کوائف اور جذبوں کی ترجمانی بھی کی ہے جو کسی مرد شاعر سے ممکن نہ تھا لیکن وہ اسی دائرے میں گھر کر نہیں رہ گئیں۔ انہوں نے نسوانی فضا سے آگے بڑھ کر اور ذات کے حصار سے باہر نکل کر عام انسانی فضائے حیات اور مسائلِ کائنات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور اس خوبصورتی وتواتر کے ساتھ کہ ان کا شمار عصر حاضر کے نمائندہ ومعتبر

شعرا میں کیا جاتا ہے۔ بعد کو مرد شعرا کے دوش بدوش جو خاتون شعرا کے نام تیزی سے اُبھر کر سامنے آئیں ہیں ان میں زہرہ نگاہ، کشور ناہید، عرفانہ عزیز، فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر کے نام بہت ممتاز ہیں ان میں ہر ایک کا اپنا لب ولہجہ صرف عورت کے لب ولہجہ کا نمائندہ و ترجمان نہیں بلکہ جنس وصنف سے بلند ہو کر آدم وحوا دونوں کے جذبات ومحسوسات کو یکساں آئینہ دکھاتا ہے۔ پچھلے چند برسوں میں کچھ اور خواتین بھی شاعر کی حیثیت سے منظر عام پر آئیں ہیں اور اپنا لب ولہجہ تراشنے کی کوشش میں لگی ہوئی ہیں۔ لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ خواتین شعرا کی اس فہرست میں پہلا معتبر نام ادا جعفری کا ہے اور انہیں کی راہبری وپیش قدمی نے اوروں کو اس راہ پر چلنے کی ہمت دلائی ہے۔

برجیس طلعت نظامی کی شاعری پر سرسری نظر

برجیس طلعت نظامی کسی تعارف کی محتاج نہیں وہ اپنے افسانوں کی وجہ سے خاصی شہرت رکھتی ہیں لیکن اس وقت میرے سامنے ان کا مجموعہ کلام ''بہار اور خزاں'' ہے جو ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں غزلیں، نظمیں، گیت اور قطعات بھی کچھ ہیں اور اس بات کی گواہ ہیں کہ برجیس طلعت نظامی ہمہ جہت صلاحیتوں کی مالک ہیں۔ انہوں نے شعر گوئی کی طرف کیوں رجوع کیا؟ اس سوال کے جواب میں وہ خود ''حرفِ صداقت'' کے عنوان سے لکھتی ہیں۔

''میں اپنے آپ کو مبتدی ہی سمجھتی ہوں اور فنِ شاعری سے اتنی واقفیت نہیں رکھتی جتنی کہ ہونا چاہیے۔ بعض اوقات زندگی میں ایسے انقلاب آجاتے ہیں جن کا انسان تصور بھی نہیں کرسکتا۔ ایسا ہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا۔ ایک شام اچانک میری بیٹی زیبا نظامی ہمیشہ کیلئے جدا ہوکر قبر کی آغوش میں سوگئی۔ اس کی ناگہانی موت نے مجھے زندہ درگور کردیا۔ جب بھی اس کی یاد آتی ہے آنسو الفاظ کا روپ دھار لیتے ہیں۔ اور پھر وہی الفاظ شعروں میں منتقل ہوکر کاغذ پر نمودار ہوجاتے ہیں اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتی۔ یہی میری شاعری کی حقیقت واساس ہے''۔

برجیس طلعت نظامی کے مجموعہ کلام سے ایک مختصر سی غزل یہاں نقل کرتا ہوں۔

محبت کا قرینہ آگیا ہے!
تری فرقت میں جینا آگیا ہے

گزر کر حادثوں سے رفتہ رفتہ
سرِ ساحل سفینہ آ گیا ہے
گھٹائیں دیکھتے ہی آسماں پر
خیالِ خام و مینا آ گیا ہے
نگاہیں منتظر ہیں آ بھی جاؤ
کہ ساون کا مہینہ آ گیا ہے
مداوائے غمِ ہستی یہی ہے
مجھے اشکوں کو پینا آ گیا ہے

بینا حسن، جاگتے ہوئے احساس کی شاعرہ

''احساس کا سفر'' کی صورت میں بینا اور دیدۂ بینا دونوں میرے سامنے ہیں۔ مجھے بینا کے بیشتر اشعار آنکھ ملتے ہوئے شعور، جاگتے ہوئے احساس اور اُمنڈتے ہوئے جذبوں اور درونِ خانہ کے ہنگاموں سے لبالب نظر آئے، مثلاً چند اشعار دیکھئے۔

وہ رنگ و نور کی روشن کتاب سے چہرے
سما گئے ہیں نظر میں گلاب سے چہرے

نئے نئے سے تکلم کے سلسلے دیکھے
سوال کرتی نگاہیں جواب سے چہرے

ہر ایک شئے سے کچھ اس طرح اعتبار اُٹھا
لگے نگاہ کو سارے سراب سے چہرے

بینا حسن کے کلام کو دیکھ کر یقین آیا کہ ان کی نظر سے غالب کا یہ شعر گزرا ہے

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہُوا دیدۂ بینا نہ ہُوا

بینا حسن شاعری کو کھیل نہیں سمجھتیں بلکہ وہ فی الواقع دیدۂ بینا رکھتی ہیں تب ہی تو انہوں نے کہا۔

اگر خودی ہے تو ہم دل کے زخم سی لیں گے
یہی بہت ہے کہ ہم سر اُٹھا کہ جی لیں گے

جواب مانگنا اک اپنا حق جائز ہے
سوال ہم بھی کریں گے جواب بھی لیں گے

مُسافران رہِ حق کو ہر ستم ہے قبول
ملے گا زہر تو امرت سمجھ کے پی لیں گے

عوض متاعِ دل و جاں، کے ہم بھی اے بینا
سکون و امن خریدیں گے آشتی لیں گے

بینا کی شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شعر نہیں کہتیں بلکہ شعر خود کو ان سے کہلواتا ہے، زیادہ حیرت اس بات پر ہوئی کہ بینا جو کچھ دیکھتی ہیں اُسے دوسروں کو دکھانے کا ہنر بھی جانتی ہیں۔ آپ بھی چند اشعار دیکھئے اور داد دیجئے۔

روشن ہے اِک الاؤ مرے دل کے آس پاس
جذبوں کا اِک بہاؤ ہے ساحل کے آس پاس

دل کو ہے ایک تلاشِ مسلسل نجانے کیوں
ڈوبی ہے کوئی ناؤ مرے دل کے آس پاس

کشتی مری پلٹ گئی منجدھار کی طرف
شاید فضا کچھ اور تھی ساحل کے آس پاس

حسرت خود اشکبار ہے اُس بدنصیب پر
لُوٹا گیا جو راہ میں منزل کے آس پاس

تھا بزم دل میں ذکرِ شہیدانِ کربلا کا
اِک نُور سا تھا قلب کے محفل کے آس پاس

میری دعا ہے کہ بینا حسن کا قدم دنیائے شعر میں روز بروز آگے بڑھتا رہے ان کا کلام قبول عام حاصل کرے، اہل نظر سے داد پائے اور اُردو شاعری کے مستقبل کو تابناک بنائے۔ بینا نہ صرف یہ کہ مذہب سے عقیدت رکھتی ہیں بلکہ ان کے اندر روشن خیالی کا ایک طاقتور عنصر بھی پایا جاتا ہے اس عنصر کی جھلک ذیل کے اشعار میں صاف دکھائی دے رہی ہے۔

ظلمتوں میں راستہ دکھلائے گا یہ آپ کو
شب اندھیری ہو تو اپنا دل ستارا کیجئے

عزم و جرأت سے جینا زندگی کا حُسن ہے
گردشِ دوراں میں بھی ہمت نہ ہارا کیجئے

کارواں کو راہ میں بے آسرا چھوڑا ہے کیوں
منزلوں کی سمت بھی کوئی اشارا کیجئے

جان و دل کے بعد اب باقی ہے کیا جُز اعتماد
یہ جو سالم ہے اسے بھی پارا پارا کیجئے

مندرجہ بالا اشعار پر بینا حسن کی دانش و بینش دونوں کی گواہیاں ثبت ہیں، صاف اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کائنات کا مشاہدہ توجہ سے کرتی ہیں اور حواس خمسہ کے وسیلے سے جو کچھ حاصل کرتی ہیں اُسے اپنی غور و فکر کا جز و بنالیتی ہیں۔ یہی نہیں غور و فکر کے بعد جب وہ اپنے حسی تجربوں کو لاشعور کے خانے سے اُٹھا کر شعور کی سطح پر لاتی ہیں اور انہیں فن کاری کے درجے پر فائز کرنا چاہتی ہیں تو انہیں اس ہنرمندی کی نمائش میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

پروین جاوید، کیف پرور نعتوں کی امین

عمومی شاعری کے برعکس نعتیہ شاعری فکر و دانش اور مہارت فن سے زیادہ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ اور اُسوۂ حسنہ سے کششِ باطنی اور والہانہ لگاؤ کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ والہانہ لگاؤ جس قدر شدید و توانا ہوگا اسی قدر نعتیہ شاعری موثر اور طاقتور ہوگی۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ والہانہ لگاؤ جس کا دوسرا نام عشقِ رسول ﷺ ہے ہر ایک کو نہیں کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ یہ عشق دراصل عطیۂ وہبی یا ایک طرح کا فیضانِ الہیٰ ہے جو کبھی تو لالہ صحرائی کو بھی داغِ جگرتاب کی دولت دے کر اسے پُرکشش و سرخ رو رکھتا ہے اور کبھی لعلِ بدخشاں کو شرارِ سنگ سے محروم کر کے اُسے عام پتھروں سے فروتر کر دیتا ہے۔

یہ دیکھ کر مجھے دلی خوشی میسر آئی کہ پروین جاوید کو حضور اکرم ﷺ کی ذات سے نسبتِ خاص ہے اور اُنہیں عشقِ رسول ﷺ کی وہ جگرتابی میسر ہے جس کا ذکر اُوپر آیا ہے اور یہ اسی جگرتابی کا ثمرہ ہے کہ اُنہوں نے بہت جلد نعتیہ شاعری کے میدان میں اپنے لئے ایک نہایت معتبر و قابلِ توجہ مقام و مرتبہ بنالیا ہے، اُنہیں خود بھی عشقِ رسول ﷺ کے اس فیضان کا ادراک و احساس ہے تبھی تو کہتی ہیں کہ

عشقِ احمد ﷺ ہے جو آنکھوں کو ضیاء دیتا ہے
پر یہ رتبہ جسے دیتا ہے خدا دیتا ہے
زد میں آجاؤں ہواؤں کی تو پھر اس کا خیال
میری بجھتی ہوئی شمعوں کو جلا دیتا ہے
پہلے کرتا ہے مجھے خواہش دینا سے الگ
اور پھر زیست کو احساس نیا دیتا ہے

راہ ہستی میں اگر موجِ حوادث ہو بلند
وہ بلندی مرے قامت کی بڑھا دیتا ہے
مجھ کو واماندگئی جاں سے بچانے کے لئے
اُس کا غم حوصلۂ زیست سوا دیتا ہے
اُس کی نسبت سے ہیں آباد و فروزاں ہم لوگ
ورنہ اب شہر میں آسیب صدا دیتا ہے
عشقِ احمدﷺ کا مشرف ہے کہ جو پروین مجھے
گھپ اندھیروں میں بھی منزل کا پتہ دیتا ہے

واقعہ بھی یہی ہے کہ اللہ نے پروین جاوید کو جہاں قابلِ رشکِ تخلیقی قوت سے نوازا ہے وہیں اُنہیں نعت گوئی کا غیر معمولی سلیقہ بھی عطا کیا ہے۔ اس عطائے خداوندی کی معرفت پروین جاوید کی نعت گوئی کیسے کیسے محاسن لفظی و معنوی سے مالا مال ہوگئی ہے اور پروین نے اپنے سامع اور قاری کو کیسی کیسی معجز نمائیوں اور ہنر مندیوں سے مسحور و حیرت زدہ کیا ہے۔ مثلاً نعت کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

فخرِ یحیٰؑ آپؐ ہیں میرے حضورؐ
فخرِ عیسیٰؑ آپؐ ہیں میرے حضورؐ
دو جہاں میں شانِ آدمؑ آپؐ سے
فخرِ حوا آپؐ ہیں میرے حضورؐ
انبیاء کے آپؐ ہی سردار ہیں
سب سے بالا آپؐ ہیں میرے حضورؐ

آپؐ ابراہیمؑ و عیسیٰؑ کی دعا
وجہِ دنیا آپؐ ہیں میرے حضورؐ
باعثِ تخلیقِ عالم آپؐ ہیں
کل کے آقا آپؐ ہیں میرے حضورؐ

مجھے یہاں پروین جاوید کے اس وجدانی اور نشاط آور شعر کی بھی داد دینی ہے

غمِ دنیا سے دوری چاہتی ہوں
درِ طیبہ حضوری چاہتی ہوں

یہ شعر فکروفن کی لطافتوں کے جلو میں حضورﷺ سے شاعرہ کی والہانہ عقیدت و فریفتگی کی معرفت انبساطِ روح کا ایسا سامان فراہم کررہا ہے کہ وجدان جھوم جھوم جاتا ہے۔ ذہن عش عش کر اُٹھتا ہے اور زبان پر بے ساختہ سبحان اللہ سبحان اللہ کا ورد جاری ہوجاتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس شعر میں ارتعاشِ جذبات کا اظہار مضطربانہ آرزومندی کے ساتھ ایسے خوبصورت انداز میں ہوا ہے کہ اس سے بہتر صورت کا امکان نہیں رہتا۔ ایک نعت کے اشعار اور دیکھتے چلیے۔

کُھلے لب حبیبؐ خدا کہتے کہتے
دوبارہ ملے مصطفیٰؐ کہتے کہتے
ہوئی دل کو تسکیں دعا پڑھتے پڑھتے
مقدر بنا مجتبیٰؐ کہتے کہتے
ہے قدسی کو بھی قُرب ربُّ العُلیٰ کا
ملا ہے حبیبؐ خدا کہتے کہتے

خدا کی قسم آپؐ یوسف نظر ہیں
چھپے چاند تارے ثنا کہتے کہتے
شفیع الامم ہی کریں گے شفاعت
یہ زاہد رہیں یا خدا کہتے کہتے
شرف بازیابی کا اُس کو ملے گا
حرم جو گیا مصطفیٰ کہتے کہتے
خطا کار پر بھی کرم کی نظر ہو
کٹی عمر یہ مدعا کہتے کہتے
بھنور سے بچا لوں گی میں اپنی کشتی
حبیبِؐ خدا نا خدا، کہتے کہتے

میں پروین جاوید کو فکر وفن کی اس غیر معمولی دسترس پر مبارکباد دیتا ہوں اور اُنہیں صفِ اوّل کے نعت نگاروں میں شمار کرتا ہوں۔ ان کی ساری نعتیہ شاعری خواہ وہ نعتیہ غزل کی صورت میں ہوں خواہ رباعیات و قطعات کی شکل میں جملہ لفظی و معنوی محاسن سے مالا مال ہے اور قاری پر نہایت خوشگوار و حیرت انگیز اثر ڈالتی ہے۔ یہاں چند قطعات اور رباعیات پیش کرتا ہوں۔

اخلاق کی تعبیر وہی کرتے ہیں
قرآن کی تفسیر وہی کرتے ہیں
وہ جن کو بنایا گیا محبوبِ خدا
انساں کی بھی تعمیر وہی کرتے ہیں

اِک متاعِ یقین ملی ہم کو
زندگی یوں حسیں ملی ہم کو
حُبِّ احمدؐ کے جب امین ہوئے
اِک بہشتِ بریں ملی ہم کو

نبیؐ کے عشق کا چمکا نگینہ
مجھے آیا ہے جینے کا قرینہ
کوئی دوری گوارا اب نہیں ہے
سوئے طیبہ چلا میرا سفینہ

مجھ کو توفیق سفر کی دے دو
سفرِ گنبدِ خضرا مولا
میں کہ عاصی و خطا وار سہی
مجھ کو دو اپنی تمنّا مولا

پروین کی نعتیہ شاعری میں روضۂ اقدس کی زیارت کا جو ذوق وشوق بھرپور انداز میں اُبھرتا نظر آتا ہے وہ ان کے عشقِ رسول ﷺ کی گواہی ہے۔

پروین نظیر سومرو اور "بے صدا دریچے"

شاعری کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں لیکن مختصر ترین الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاعری، شخصیت کا دوسرا روپ ہے، شخصیت جتنی شائستہ و نفیس اور سنجیدہ ہوگی شاعری میں بھی اسی قدر شائستگی، بانکپن اور سلیقہ ہوگا۔ اور یہی سلیقہ مجھے پروین نظیر سومرو کی شاعری میں نظر آیا۔ ان کا مجموعہ کلام "بے صدا دریچے" اس وقت میرے سامنے ہے جس کی روشنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی شاعری کے ظاہر و باطن میں بڑی دل کشی اور موثر ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

ان کے بعض اشعار میں فانی بدایونی کے فلسفہ غم کی پرچھائیں صاف دکھائی دیتی ہیں۔

چند اشعار دیکھتے چلیے:

قلب و نظر کو اور بھی ویران کر گیا
اس کا خیال کتنا پریشان کر گیا

دنیا نے ضبطِ غم کے سلیقے سکھا دیئے
موسم غموں کے آئے تو ہم مسکرا دیئے

غم کے افسانے میں ڈھل جائے گی پروین آخر
روز و شب گردشِ دوراں سے گزار کرتے

اب میں ہوں زندگی کی سب آسائشوں سے دور
گردش کے ساتھ بہنے کی خواہش کسے نہ تھی

ان اشعار کا رنگ وروپ صاف ظاہر کرتا ہے کہ زبان کی صفائی ستھرائی اور شعر کی نوک پلک سنوارنے کا فن پروین نظیر سومرو کو خوب آتا ہے۔ انہوں نے اپنے فن کی تخلیق اپنے خونِ جگر سے کی ہے ان کا یہ شعر دیکھئے:

خواب ہو دل یا تعلق ہو
ٹوٹنے کی صدا نہیں آتی

اس شعر میں بڑی صداقت ہے جو لوگ ان کے کلام پر نظر ڈالیں گے وہ میری اس بات کی تائید کریں گے کہ ان کا اسلوب نہایت خوش گوار ہے۔ ان کے مجموعہ کلام ''بے صدا دریچے'' جو غزلوں، نظموں، آزاد نظموں اور ہائیکو پر مشتمل ہے اس میں زندگی کے تلخ و شیریں حقائق کو فنی تجربے کی مدد سے پیش کر دیا گیا ہے۔ بعض اشعار ایسے ہیں جو لطف لینے کے ساتھ ساتھ سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔ ایک نظم دیکھئے جس کا عنون ہے ''مرے بچے''

رنگیں طیور ہیں مرے بچے مرے لیئے
دل کا سرور ہیں مرے بچے مرے لیئے
یہ پاس ہوں تو سارے مناظر ہیں خوشنما
میرا غرور ہیں مرے بچے مرے لئے
دیتے ہیں اپنے پیار سے آنکھوں کو روشنی
آنکھوں کا نور ہیں مرے بچے مرے لئے
یہ میری شاعری مرے بچوں کے نام ہے
میرا شعور ہیں مرے بچے مرے لئے

پروین نظیر سومرو کے یہاں صالح اور جاندار روایت کا تسلسل ہے جو ماضی کی کوکھ

سے جنم لے کر حال کو سنوارتا ہے اور مستقبل کو نویدِ بشارت دیتا ہے۔ مزید یہ کہ پروین نے ماضی کی مثبت اقدار سے جڑے رہنے کے باوجود عصری تقاضوں یا جدید رجحانات کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ قدیم و جدید کے خوبصورت ملاپ سے دل و دماغ کے لئے لطف اندوزی و فکر انگیزی کا سامان بھی فراہم کر دیا ہے۔ وہ جتنی اپنی غزلیہ شاعری میں کامیاب ہیں اتنی ہی نظموں اور ہائیکو میں بھی ہائیکو کا نمونہ دیکھتے چلیے:

دل یہ ہے تحریر
میں کبھی نہ پاؤں گی
سپنوں کی تعبیر

جینا ہے دشوار
من میں آگ لگاتی ہے
پائل کی جھنکار

بگڑی بن جائے
مجھے پر تیری رحمت کی
کھڑکی کھل جائے

دو گے میرا ساتھ
ہاں ذرا اک بار کہو
دل پہ رکھ کے ہاتھ

نہ تیرا ہے نہ میرا
سن صدائیں جوگی کی
دنیا دین بسیرا

اک جیسی تقدیر
آنکھیں برسیں دونوں کی
کیا لیلیٰ کیا ہیر

پروین نظیر کا پورا مجموعہ کلام جذبہ کی صداقتوں میں ڈوبا ہوا ہے اور لفظوں کے دلآویز پیکروں میں سجا ہوا ہے۔ مختصر یہ کہ ان کی شاعری تادیر زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

تسنیم فاطمہ کی شاعری

اس وقت میرے پیشِ نظر ''لعلِ بدخشاں'' ہے یہ سُرخ رنگ کا کوئی قیمتی پتھر نہیں بلکہ تسنیم فاطمہ کا تخلیق کردہ حرف وصوت کا زائیدہ ''شعری مجموعہ'' ہے اور مجھے اسی کے حوالے سے تقاضائے شاعری کے بارے میں خصوصاً کچھ کہنا ہے۔

شاعری خصوصاً قابلِ توجہ شاعری اپنے خالق سے کیا کچھ نہیں چاہتی، اس کے چاہنے میں علم و بیان وعلمِ کلام سے آگاہی، وزن و بحر کے نکات سے شناسائی، عروضی آہنگوں کے نشیب وفراز سے واقفیت اور نظامِ قوافی و ردیف سے باخبری سبھی کچھ شامل ہیں۔ یہی نہیں بلکہ لائقِ اعتنا شاعری فکر و دانش کی وسعتوں کے ساتھ نفسیاتِ انسانی کا مطالعہ، گردوپیش کی زندگی کا مشاہدہ، سماجی وسیاسی حالات کا شعور اور پھر اس کے حُسن کا راز اظہار وابلاغ کے لئے زبان و بیان پر کامل عبور کا بھی تقاضا کرتی ہے۔ لیکن ان باتوں کا اطلاق تخلیقِ شعر پر ہوتا ہے یعنی اِن اوصاف سے شعر کی نوک پلک سنوارنے اور اسے وزن و بحر سے ہم آہنگ کرنے کا کام تو لیا جاسکتا ہے لیکن ان کی مدد سے شعر نہیں کہا جاسکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو دنیا کے سارے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باشعور وذہین لوگ صفِ اوّل کے شاعر ہوتے لیکن ہم دیکھتے ہیں ایسا نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ اچھی اور سچی شاعری علم وفضل کی ثروت سے نہیں بلکہ اس خداداد صلاحیت اور جوہرِ ذاتی سے جنم لیتی ہے جس کا دوسرا نام مذاقِ سلیم ہے۔

یہ مذاقِ سلیم جتنا پاکیزہ وپختہ ہوگا اسی قدر شاعری بھی شائستہ وپاکیزہ ہوگی۔ لیکن فطری جوہر یا مذاقِ سلیم کی آبیاری کیلئے بھی خاص ماحول درکار ہوتا ہے۔ یہ مذاقِ سلیم مدرسوں اور خانقاہوں میں پرورش نہیں پاتا بلکہ ایک خاص عمر اور ایک خاص مدت تک شعروادب کی فضا

میں سانس لینے اور زندگی بسر کرنے سے پروان چڑھتا ہے۔ خوش بخت اور خوش اوقات ہیں وہ لوگ جنہیں یہ ماحول میسر آیا اور جن کے تخلیقی ذہن نے اشعار کی معرفت کشتِ جاں کی بے کیف و بے جاں زمین کو سیراب و شاداب کر کے اسے توانائی و تازگی سے ہمکنار کیا۔ ''لعلِ بدخشاں'' کی مالک و خالق ''تسنیم فاطمہ'' ایسی ہی نفوسِ خوش اوقات میں سے ہیں جنہیں اللہ نے شعر گوئی کا جوہرِ ذاتی بھی عطا کیا اور پھر اس جوہر کو قرینے سے پروان چڑھانے کیلئے خوشگوار و سازگار ماحول میں مہیا کیا۔ یہ توفیقِ الٰہی نہیں تو اور کیا ہے کہ تسنیم نے ایک اسے خانوادے میں آنکھ کھولی جس میں شعر و ادب کی روایت کئی پشتوں سے چلی آ رہی تھی اور جو سالہا سال سے ثقافتی و تہذیبی قدروں کا وارث و امین تھا۔ تسنیم کے دادا، پرداد، والد، چچا عم زاد اور ہمشیر زاد سبھی کو شعر و سخن سے طبعی دلچسپی تھی نہ صرف دلچسپی تھی بلکہ ان میں سے بیشتر شعر کہتے تھے اور شعر گوئی اور شعر فہمی کو تہذیبِ شائستگی کا اساسی نشان جانتے تھے۔ گویا شعر و سخن کے واسطے سے تسنیم جس فضا میں سنِ شعور کو پہنچیں وہ فضا بذاتِ خود محبوبہ جماں کے نگاہِ ناز کی حیثیت رکھتی تھی اور مولانا حسرت موہانی کے لفظوں میں:

نگاہِ ناز جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

تسنیم فاطمہ نے ''لعلِ بدخشاں'' کے دیباچے میں اپنی اسی خوبیٔ قسمت پر ناز کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''میری شاعری میرے خانوادے کا عطا کیا ہوا وہ لہو ہے جو میری حیات کی شریانوں میں جبراً نہیں اختیاراً گردش کرتا ہے''۔

یہ محض دعویٰ یا تعلّی شاعرانہ نہیں بلکہ امرِ واقعہ ہے۔ تسنیم نے جس خانوادے میں پرورش پائی وہ شعروادب کے حوالے سے ہمہ خانہ آفتاب کی حیثیت رکھتا ہے تسنیم کو یقیناً اس آفتاب سے روشنی ملی ہے لیکن انہوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی جستجو پسند طبیعت نے گھر کے باہر کی روشنی سے بھی کسبِ نور کیا ہے اور اس طرح انہوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ اپنے ثقافتی ورثے کو چار چاند لگا دیئے ہیں بلکہ اُسے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے اس میں تادیر زندہ رہنے کی سکت بھی پیدا کر دی ہے۔

تسنیم کے شعری مجموعے "لعلِ بدخشاں" میں بہ اعتبار ہیئت واصناف کیا کچھ نہیں ہے۔ ابیات، قطعات، منظومات اور غزلیات سبھی کچھ ہیں لیکن غزل کا پلّہ سب سے بھاری ہے صرف مقدار کے اعتبار سے نہیں بلکہ معیارِ سخن کے اعتبار سے بھی اور آپ جانتے ہیں کہ معیارِ سخن ہی کا دوسرا نام غزلیت، تغزل، لطافت اور شعریت ہے، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ غزل اور غزل کا مزاج سارے "لعلِ بدخشاں" پر حاوی ہے اور غزل کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ یہ وضاحت سے دور بھاگتی ہے اور رمز و کنایہ کے پیرائے میں ڈھکا چھپا کہ بات کرنے کو کمالِ فن جانتی ہے۔ بات فکر و نظر کی ہو یا جذبے اور احساس کی، تصوف کی ہو یا فلسفہ و حکمت کی روایت کی ہو یا بغاوت کی، غمِ عشق کی ہو یا غمِ روزگار کی، سیاست کی ہو یا محبت کی، آرائشِ خمِ کاکُل کی ہو یا اندیشہ ہائے دور دراز کی، غزل کبھی کُھل کر سامنے نہیں آتی بلکہ دھیمے اور ملائم لہجے میں رموز و علائم کے پردے میں اپنا مطلب صاف ظاہر کرتی ہے اور چند لفظوں میں وہ سب کچھ کہہ جاتی ہے جو کچھ وہ کہنا چاہتی ہے البتہ غزل کہنے کا سلیقہ سب میں نہیں کسی کسی میں ہوتا ہے اور کسی کسی کی اس تخصیص میں تسنیم فاطمہ کا نام بھی شامل ہے۔

جیسا کہ خود تسنیم فاطمہ نے "لعلِ بدخشاں" کے دیباچے میں نشان دہی کر دی ہے

کہ وہ خوب جانتی ہیں کہ شاعری خصوصاً غزل کی شاعری قافیہ پیمائی نہیں معنی آفرینی کا نام ہے انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ غزل دنیائے فنِ سخن کی ایسی محبوبہ ہے جس کے حُسن کا راز سینہ تان کے بے محابا سامنے آجانے میں نہیں بلکہ سر پہ آنچل ڈال کر تیزی سے آگے نکل جانے میں ہے غالب نے اپنے ایک فارسی شعر میں کہا ہے کہ نظارہ سرِ بام میں وہ لطف کہاں جو کیواڑ کی اوٹ سے تاک جھانک لگانے میں ہے۔ اسی لئے تسنیم نے جو کچھ کہا خواہ اس کا تعلق ذات سے ہو یا کائنات سے، کسی کے مہر سے ہو یا کسی کے قہر سے، غزل کے پیرائے میں کہا ہے اور ایسی سادگی و پرکاری کے ساتھ کہا ہے کہ ان کی غزلوں کے ظاہری اسلوب اور معنوی تہداری کو دیکھ کر غالب کا شعر خود بخود ذہن میں اُبھر آتا ہے

سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری
حُسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

پیرایہ شعر کی اس سادگی و پرکاری سے تسنیم کے مزاج کو خاص مناسبت ہے اور اسی لئے انہوں نے غزل ہی کے پیکر کو اپنے اظہار کے لئے انتخاب کیا ہے چنانچہ ان کی غزل کے فکر و نظر کی جملہ دلربائیوں اور ساری کج ادائیوں کی ترجمان ہے۔ خود کہتی ہیں:

ابتداء سے انتہا تک تم سے میری ذات تک
میرا سارا حال غزلوں میں میری مرقوم ہے

کبھی تسنیم کی غزلیں کبھی تسنیم کی خُو
مجھ کو رُسوا سرِ بازار کریں گی دونوں

یہ ادعا تسنیم کی خود رائی اور خود نگری یا شاعرانہ تعلّی پر مبنی نہیں بلکہ اپنے آپ سے

آ گاہی اور اپنی ذات و صفات سے طبعی آ شنائی کا مظہر ہے۔ تسنیم کی سوچ کے اس اندازِ خاص کو اُن کے شعورِ تنقید خصوصاً اپنی غزل کے احتساب سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ انہوں نے غزل کے پردے میں وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو ایک مدت سے ان کے تحت الشعور میں پناہ گزیں تھا اور جس نے ان کے نہاں خانۂ دِل کو طرح طرح کے ہنگاموں سے دوچار کر رکھا تھا اپنے اس نہاں خانۂ دل کی غمازی و عکاسی تسنیم نے کس کس انداز سے کی ہے اور ذاتی حوالوں کو عمومیت و اجتماعیت کا رنگ دے کر کس طرح سے ادب کے قاری کو جذبے اور احساس کی سطح پر اپنا شریک و رفیق بنا لیا ہے۔ اس کی توضیحات و جزئیات میں نہ جاؤں گا بات طویل ہو جائے گی اور ''لعل بدخشاں'' اُسے اپنے دامن میں جگہ نہ دے سکے گی اس لئے صرف چند اشعار دیکھتے چلیے اور اگر ذوقِ سخن رکھتے ہوں تو داد دیجیے:

وقت اِک وہ بھی سرِ راہِ عمل آتا ہے
جب محبت میں خطائیں نہیں دیکھی جاتیں

وہ میری زُلف پہ کیا نظم لکھیں گے تسنیم
جن سے ساون کی گھٹائیں نہیں دیکھی جاتیں

تجھ کو کیا علم کہ میں کاسۂ محرومی کو
خود کو دے دیتی ہوں اور تجھ کو بچا رکھتی ہوں

میرے ہنسنے پہ نہ جاؤ کہ میں ہنسنے کے لئے
اک ہنر اپنی طبیعت میں جُدا رکھتی ہوں

اب کے خط اُس کا جو آیا تو تعجب یہ ہوا
نہ دعائیں نہ تشکر نہ تردد نہ سلام

زیب دیتا ہی نہیں چاہنے والوں پر کبھی
کسی بچے کی طرح بات مچل کر کرنا

پہلے اِک بوسے کی چاہت میں ہزاروں رقص تھے
تتلیاں جب پھول تک آئیں تو شرمائیں بہت

آئینے کی بے لباسی کو چھپانے کے لئے
رات نے زُلفیں میرے چہرے پر بکھرائیں بہت

لکھنے بیٹھی تو قصیدوں پہ قصیدے لکھے
اور بیٹھی ہوں تو اِک حرف لئے بیٹھی ہوں

جب نہ بادل میرے بس میں ہے نہ دریا دل کا
پھر یہ آنسو میری پلکوں پہ لرزتے کیوں ہیں

وعدہ آساں ہے مگر اس کو نبھاؤ تو سہی
تم بھلا دو گے مجھے خیر بھلاؤ تو سہی

اگر ملے ہو تو باتوں میں کیا تکلف ہے
ہر ایک چیز کا محور ادب نہیں ہوتا

یہ سارے اشعار اُردو کی لازول کلاسیکی شاعری کی لطافتِ احساس اور جذباتی صداقت کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہیں زبان و بیاں اور تراکیب وتشابیہ سب میں وہی رکھ رکھاؤ ملتا ہے جو امیر خسرو سے لے کر فراق گورکھپوری تک کلاسیکی رنگِ سخن کا طرہ امتیاز رہا ہے لیکن تسنیم کے ان اشعار میں تجربے کی جو تازہ کاری اور فکر و خیال کی لالہ کاری ہے وہ یکسرنئی اور تسنیم کی اپنی ہے اور صاف پتہ دیتی ہے کہ شاعر کا تعلق قدیم سے نہیں بلکہ اسی دورِ جدید سے ہے جس میں آج کا قاری سانس لے رہا ہے اور جس سے شاعر کی فکر و نظر نے اخذ و استفادہ کیا ہے یہ اشعار اس امر کی بھی نشاندہی کرتے ہیں کہ تسنیم کے مزاج و طبیعت میں جدت کے ساتھ ساتھ ایک ایسی نادیدہ شدت بھی ہے جس کا ارتعاش وتموج انہیں ہمہ وقت مضطرب رکھتا ہے نیتجتاً وہ اس کے لئے ہر لمحہ کسی نہ کسی پناہ گاہ کی تلاش میں رہتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ پناہ گاہ انہیں خارج میں میسر نہیں آسکتی بلکہ داخلی ارتعاش کیلئے داخلیت ہی مناسب پناہ گاہیں مہیا کرسکتی ہے چنانچہ خلاّق ذہنوں کے مالک شعراء کے یہاں اس طرح کی پناہ گاہیں خوبصورت ترکیبوں اور استعاروں کی صورت میں ملتی ہیں یہ ترکیبیں اور استعارے ایک طرف شاعر کی اختراعی قوت پر دلالت کرتے ہیں تو دوسری طرف اس کے دُرون خانہ کے ہنگاموں کو زبان دے کر اس کی ترجمانی کا حق ادا کرتے ہیں۔ تسنیم نے بھی اسی تخلیقی حربے سے کام لیا ہے چند شعر دیکھئے۔

زندہ رکھتا ہے فقط ذہن کو اِک ابرِ جمال
دشت بے آب میں بن جاتی ہے جب گرد الاؤ

ہُنر کا جام ادب کا علم سجائے ہوئے
گزر رہی ہوں میں بارِ قلم اُٹھائے ہوئے

مدت ہوئی ہے سنگِ ملامت نہیں ملا
تسنیم میرے چاہنے والے کدھر گئے

یوں تو تسنیم نہ اُٹھتا یہ دلِ حشر مزاج
تم نے اس فتنۂ غافل کو جگایا تو اُٹھا

میں نے تسنیم سرِ عرش جلائے ہیں چراغ
جب بھی وہ قصرِ ہُنر میں مرے آ کر ٹھہرا

اس کو کیا ہوگیا تسنیم کہ وہ سرد مزاج
زُلف بکھراؤں تو ساون کا مہینہ چاہے

یہ اشعار خالص غزل کے ہیں اور ان کے معنی زیریں لہریں حُسن و عشق کی سرگرمیوں سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن وہ روایتی خود سپردگی یا وارفتگی ان میں نظر نہیں آتی جو کلاسیکی شاعروں کے طبع عاشقانہ کی صفتِ خاص شمار کی جاتی ہے بلکہ ان اشعار میں ایک طرح کی خودنگری وخوداعتمادی اور پندارِ انا کی ایسی حوصلہ مندی و جائیت در آئی ہے جو کبھی تو محبوب کو عاشق نما اور کبھی عاشق کو محبوب نما بنا کر پیش کرتی ہے لیکن خرد کو جنوں اور جنوں کو خرد کا رنگ دینے والی یہ پناہ گاہیں اور کرامتیں تسنیم کے اشعار میں یوں ہی پیدا نہیں ہوگئیں جیسا کہ اُوپر واضح کیا گیا ہے ان کے اشعار میں یہ جادو دراصل ان نادر و خوبصورت استعارات وفارسی تراکیب نے جگایا ہے۔

یہ ترکیبیں دشتِ بے آب ، ابرِ جمال ، بارِ قلم ، سنگِ ملامت ، دل حشر مزاج ، فتنہ

غافل، قصرِ ہنر اور سرد مزاج وغیرہ کے نام سے تسنیم کے پیرا ئیہ اظہار کو کلاسیکی غزل کے طرزِ اظہار سے ہم رشتہ کرنے کا وسیلہ بن گئی ہیں۔ لیکن تسنیم کی نظر کلاسیکی غزل کے سلسلے میں صرف فارسی تراکیب تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کی نگاہ میں پریم وپریت کے وہ خاص رنگ بھی ہیں جو قدیم ریختہ اور دوہوں کا طرہ امتیاز ہیں مثلاً تسنیم کے صرف دو تین شعر دیکھئے:

مدھ بھری آنکھوں سے مت پینا ان ہونٹوں کو مت چھونا
قطرہ قطرہ زہر اتاریں یہ نیناں متوالے ہیں

اے گوپی اب کیا حاصل درد کی جوت جگانے سے
شام نے اپنی سُدھ بُدھ کھوئی ان کے بیچ گوالے ہیں

اے تسنیم تم اپنا ہر دے اپنے قابو میں رکھنا
رام کو کل بن باس ملا ہے آج وہ جانے والے ہیں

تسنیم کے اِن اشعار سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے ذرا دیر کے لئے برج واودھی اور فارسی الفاظ سے مرکب وہ غزل ذہن میں ابھارنی ہوگی جو اُردو غزل کی خشتِ اوّل ہے اور امیر خسرو سے منسوب ہے۔ صرف دو تین شعر دیکھئے:

زحالِ مسکیں مکُن تغافل درا اے نیناں بتائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے گائے چھتیاں

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف وروزِ وصلت چو عمر کو نہ
سکھی پیا کو جو میں نے دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

نہ نیند نیناں نہ انگ چینا نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں
کسے پڑی ہے کہ جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

غزل کے ان اشعار کے ساتھ امیر وخسرو اور امیر خسرو کے ایک ہم عصر و ہم نثر بزرگ ''بوعلی قلندر شاہ'' کا ایک ایک دوہا بھی دیکھتے چلئے:

سجن سکارے جائیں گے نین مریں گے روئے
بدھنا کیجیو کے بھور کبھو نہ ہوئے

(بوعلی شاہ قلندر)

گوری سووے سیج پر منھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے رین بھئی چھوں دیس

(امیر خسرو)

یہ ہے فارسی اور دیسی زبان کے آمیزے کی وہ کلاسیکی صورت جس سے اُردو کے قدیم کلاسیکی شعراء نے تو اکثر فائدہ اُٹھایا ہے لیکن عہدِ حاضر یا نئی نسل کے غزل گو شعراء کے یہاں اس کی نمود خاطر خواہ نہیں ہے۔ تسنیم فاطمہ نے البتہ اس فرہنگ خاص سے استفادہ کیا ہے اور اپنی عاشقانہ شاعری کو کلاسیکی رنگ سے قریب تر کر کے اسے نظر گیر و دلکش بنا دیا ہے۔

تسنیم فاطمہ کی تخلیقی صلاحیتوں کی رسائی اور کارکشائی کی ایک چھوٹی سے مثال اور دیکھتے چلئے۔ جدید اُردو غزل کے نامور شاعر فراق گورکھپوری کی ایک بہت مشہور اور طویل و خوبصورت غزل ہے بلکہ دوغزلہ وسہ غزلہ کی صورت میں ہے اور اس میں انہوں نے بعض ایسے بلند پایہ عاشقانہ اشعار نکالے ہیں کہ بیشتر ناقدوں نے اس کا ذکر کیا ہے لیکن شاعروں نے اس غزل کی زمین کو ہاتھ لگانے کی ہمت بہت کم کی ہے۔ فراق کی غزل کے دو تین شعر

نمونۂ دیکھئے:

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسہ بھی نہیں

ایک مدت سے تیری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

بدگماں ہو کہ مل اے دوست جو ملنا ہے تجھے
بے جھجکتے ہوئے ملنا کوئی ملنا بھی نہیں

جس زمین میں اس نوع کے متعدد خوبصورت اشعار موجود ہوں اس میں طبع آزمائی کی ہمت ہر شخص نہیں کرسکتا۔ لیکن تسنیم فاطمہ نے اسے بھی اپنایا ہے اور ایسی کامیابی کے ساتھ کہ ان کی شاعرانہ خلاقی کی داد بہر حال دینی پڑتی ہے صرف دو تین شعر دیکھئے کیسے پاکیزہ ولطیف ہیں:

کوہ پیمائی میں راہوں کا بھروسہ بھی نہیں
ڈگمگا جائے اگر پیر، سنبھلتا بھی نہیں

میں نے اس شخص سے آنسو کی وضاحت چاہی
جس کو موتی کے پرکھنے کا سلیقہ بھی نہیں

جس کی خواہش پسِ پردہ کوئی رکھتا ہوگا
میں نے وہ شہر تو تسنیم بسایا بھی نہیں

آخر میں مجھے تسنیم کے شعری مجموعے کے نام یعنی ''لعلِ بدخشاں'' کے بارے میں بھی کچھ کہنا ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں یہ صرف کتاب کا اسم نہیں بلکہ تسنیم کی پوری شاعری کا اسمِ اعظم ہے اور ان کے ذہن کے قفل ابجد کی کلید ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تسنیم کی پوری شاعری اس نام کے گرد طواف کر رہی ہے یا پھر یہ اسمِ اعظم خود تسنیم کے طلسمِ شاعری کا پیچھا کیے ہوئے ہے اور انہیں سعیِ سخن کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ سعیِ وطواف کے اس عمل میں یہ ''لعل بدخشاں'' کہیں اپنی صورت بدل کر کہیں نام بدل کر اور کہیں اپنا منصب بدل کر تسنیم کی شاعری میں جگہ جگہ دخیل ہوا ہے۔ بایں ہمہ اس کے طلسم کو صاحبانِ دل واہلِ عشق کے سوا ہمہ شما نہیں سمجھ سکتے ہر چند کے بعض اشعار میں خود تسنیم نے اس کا سراغ اس طور پر دیا ہے کہ

تم نے ڈھونڈا ہی نہیں داغ فروزاں لے کر
ورنہ لاکھوں ہیں چھپے لعلِ بدخشاں مجھ میں

کب سے تسنیم کسی لعلِ بدخشاں کی قسم
درد کی جلتی ہے اِک شمع فروزاں مجھ میں

پھر بھی اس ''لعل بدخشاں'' کا ادراک بصارت و مطالعہ سے نہیں بصیرت و وجدان کی مدد ہی سے ممکن ہے۔ لیکن بصیرت و وجدان کی دولت ہر شخص کو کہاں میسر ہوتی ہے۔ حقیقت کچھ بھی ہو یہ ''اسمِ اعظم'' اس امر کا واضح اشارہ ہے کہ تسنیم کی غزل قہر و مہر کے سچے دباؤ کی سچی شاعری ہے۔ اس کی لفظیات اور اس کا ظاہری پیکر کلاسیکی سہی لیکن اس کی روح اور اس کا باطن یکسر نیا اور جدید ہے۔ اس اعتبار سے ہم عصر شاعری میں تسنیم کی شاعری

کا ایک منفرد رنگ ہے اور یہ رنگ معنی آفرینی و تازگی کا ایک ایسا بانکپن رکھتا ہے کہ کسی نوخیز شاعر کے سلسلے میں یہ معمولی نہیں غیر معمولی بات ہے اور یہی غیر معمولی بات اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ تسنیم کی شاعری کا مستقبل خاصا تابناک ہے اتنا تابناک کہ اگر انہوں نے مطالعہ و مشاہدہ اور مشق و مہارت کو اسی طرح روا رکھا تو وہ اپنے ہم عصر و ہم عمر شاعروں میں کسی وقت ایک طرح کی چکا چوند پیدا کر دیں گی۔

ثروت سلطانہ، اجتماعی سوچ کی شاعرہ

ثروت سلطانہ نے اپنے اس شعر میں

میں نے چھپا لیا ہے سمندر نگاہ میں
پھر کیوں بھلا کسی کو جزیرہ دکھائی دے

اپنے کمالِ فکروفن کا عجیب وغریب مظاہرہ کیا ہے۔ اُنہوں نے پورے سمندر کو جس میں خود ان کی ذات وصفات کا جزیرہ بھی واقع تھا اپنی آنکھوں میں چھپا لیا۔ گویا ظاہر بیں نظروں کیلئے نہ سمندر باقی رہا نہ جزیرہ لیکن ذرا غور کرنے سے اندازہ ہوگا کہ من وتو کی یکجائی کا یہ وہ مقام ہے جہاں من، تو شوم، تو من شدی، من تن شوم تو جاں شری کی صدائے الہامی کانوں میں گونجنے لگتی ہیں، سارے فاصلے اور ساری مسافتیں اس میں کھو جاتی ہیں اور منزل تک پہنچنے کی تڑپ کو قرار آ جاتا ہے، لیکن صورتِ حال اتنی سادہ نہیں ہے، سمندر کو نگاہ میں لے لینا سمندر کی ساری طغیانی و بے کرانی کو، اس کے حملہ سکوت وخروش کو، ساحل سے ہر لمحہ ٹکرانے والی ساری امواجِ مضطرب کو، سرکش لہروں کے سارے تھپیڑوں کو بے ہنگم وطوفان کے سارے خطرات کو، ایک ساحل پر بکھری ہوئی ساری سیپیوں کو اور سمندر کی تہہ سے چنیدہ سارے قیمتی موتیوں کو اپنے اندر سمیت لینا ہے، دوسرے لفظوں میں دجلہ کو قطرہ میں قطرے میں دجلہ کو دیکھنا دکھانا ہے، ذات کو کائنات میں اور کائنات کو ذات میں سمیٹ لینا ہے، گویا اس صورتحال میں شاعرہ کی ذات وصفات کا جزیرہ محض جزیرہ نہیں رہ جاتا بلکہ سمندر کی سی اتھا گہرائی، پُرسکوت بے تابی اور بے پایاں وسعت اختیار کر لیتا ہے۔ اس وسعت کے آثار ہمیں ثروت کی شاعری میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ ان کے آثار کے نتیجے میں اُن کی فکری وفنی

فتوحات ذاتی ہو کر بھی ذاتی نہیں رہیں بلکہ کائناتی بن گئی ہیں۔ اُن کے مضطرب ذہن کو قرار یا زوال نہیں آیا بلکہ اس کی بے تابیاں کچھ اور بڑھ گئیں ہیں چنانچہ سمندر کو آنکھ میں چھپا لینے کے سبب اُن کا شعری مجموعہ غالب کی زبان میں صاف صاف کہہ رہا ہے

گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال
موج، محیطِ آب میں مارے تھے دست و پا کہ یوں

ثروت کی خاص بات یہ ہے کہ وہ ذاتی سوچ کو اجتماعی سوچ سے اور اجتماعی شعور کو ذاتی شعور سے منسلک کر کے دیکھنے دکھانے کی صلاحیت رکھتی ہیں، ایک شعر دیکھتے چلئے۔

آج جو غم ہے کل نہیں ہوگا
وقت سارے دکھوں کا مرہم ہے

ثروت سلطانہ کے شعور اور ان کی سوچ کی عظمت اس میں ہے کہ وہ اپنے بارے میں کم، دوسروں کے بارے میں زیادہ سوچتی ہیں۔ وہ اپنے ذاتی دکھ درد پر اتنی دکھی اور افسردہ نہیں ہوتیں جتنی اوروں کے دکھ درد سے، رہ گیا پیرایۂ اظہار سو اس کی اہمیت اس بات میں ہے کہ انہیں اپنی سوچ کی ترجمانی کیلئے کسی شعوری کوشش کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ اُن کی سوچ لاشعوری طور پر حرف وصوت میں ڈھل کر خود بخود لفظ و معنی کی اکائی بن جاتی ہے۔

ہم سے وہ خواب بہاراں نہیں دیکھے جاتے
جو خزاؤں میں بدل جاتے ہیں آتے آتے

فضاؤں میں دھواں سا اُٹھ رہا ہے
چلو دیکھو کہ کس کا گھر جلا ہے

میں قہقہوں کے روپ میں گریہ دکھائی دوں
دل مسکرائے اور میں تڑپ کر دہائی دوں

چھوٹی سے زندگی کو ملے غم بڑے بڑے
ہم پر ہمیشہ آپ کے احسان ہی رہے

کہنے کو غم بھی زیست میں شامل نہیں رہا
لمحہ مگر فراغ کا حاصل نہیں رہا

شکلیں بدل بدل کے ملے ہر قدم پہ لوگ
کوئی بھی اعتبار کے قابل نہیں رہا

ثروت ایک اچھی غزل گو ہیں غزل کو لطیف ترین صنف سخن یعنی محسوساتِ انسانی کی پاکیزہ ترین یادوں کی انتہا سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایسے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ایک تخلیقی ذہن غزل سے جس قدر مانوس ہوگا اسی قدر اس کی شاعری شعریت و لطافت سے معمور ہوگئی۔ لائقِ تحسین بات یہ ہے کہ ثروت نے اپنی سوچ کی طبعی رو کو اپنی موجِ خیال سے اس طرح ہم خیال کر رکھا ہے کہ انہیں اشعار کی صورت میں تخلیق کے موتی رولنے میں غیر معمولی کامیابی ہوئی ہے۔ اپنے لہجے و اثر آفرینی کے لحاظ سے اشعار کے یہ موتی حد درجہ آبدار بھی ہیں اور تہہ دار بھی، یہ آبداری اور تہہ داری چونکہ لفظ و معنی دونوں پر محیط ہے، اس لئے ان کی شاعری صرف لمحہ حاضر کی گرفت تک محدود نہیں رہی بلکہ ان کے روشن مستقبل کی ضمانت بن گئی ہے۔

حمیرا رحمان کے شعری مجموعے ''اندمال'' پر ایک نظر

شاعری کے بارے میں فارسی کے مشہور شاعر صائب نے ایک جگہ کہا ہے

''طبع موزوں''

یہ طبع موزوں جو شاعری کی معرفت الفاظ میں اظہار پاتی ہے، کئی حوالوں سے خوبصورت ہوتی ہے اور ہم میں سے سارے صاحبانِ ذوق ایک اچھا شعر سُن کر کہہ اٹھتے ہیں کیا خوبصورت شعر ہے؟ کیا عمدہ کہا ہے؟ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شعر کی خوبصورتی کہاں ہوتی ہے؟ جواب یہ ہے کہ کبھی شعر کی خوبصورتی کسی خاص لفظ میں چھپی ہوتی ہے جیسے غالب کے اس شعر میں

تھی وہ اِک شخص کے تصوّر سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں

اس شعر میں ''شخص'' کی جگہ فرد کہا جا سکتا تھا لیکن فرد نے شعر میں وہ خوبصورتی پیدا نہیں ہو سکتی تھی جو ''شخص'' سے ہوئی ہے۔

شاعری کا حُسن کبھی کبھی لفظوں کے رکھ رکھاؤ میں پوشیدہ ہوتا ہے، جیسے جگر مراد آبادی کے ان اشعار میں ہے

کاملِ رہبر، قاتلِ رہزن
دل سا دوست نہ دل سا دشمن
پُھول کھلے ہیں گُلشن گُلشن
لیکن اپنا اپنا دامن

شعر کی لطافت اور خوبصورتی کبھی فارسی ترکیبوں سے پیدا ہو جاتی ہے جیسے غالب کے اس شعر میں ہے

جب وہ جمالِ دل فروز صورتِ مہر نمروز
آپ ہو خود نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

شعر کی خوبصورتی کبھی فکر انگیز استعارے کے ذریعے شعر میں نمودار ہوتی ہے جیسے غالب کے اس شعر میں ہے

غارت گر ناموس نہ ہوگر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

شعر کا حسن کبھی قافیائی نظام میں اور کبھی ردیف میں چھپا رہتا ہے جیسے داغ کے ان شعروں میں ہے

جھڑکی سہی ادا سہی چتن مہہ جبیں سہی
سب کچھ سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

غرض کے شاعری میں حُسن کی تخلیق لفظوں کے ذریعے مختلف انداز سے کی جاتی ہے اور اس کا انحصار شاعر کی خلاقی پر منحصر ہوتا ہے، لیکن مجموعی طور پر شاعری کا حُسن زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح سچائی اور صداقت بھی ہوتا ہے، صداقت سے مراد فلسفیانہ صداقت نہیں بلکہ انسانی تجربوں کی وہ نفسیاتی صداقت ہے جو واقعیاتی صداقتوں میں لپٹی ہوئی شاعری میں جگہ پا جاتی ہے۔

حمیرا رحمان کی شاعری کی خوبصورتی اور اس کی مقبولیت ان ہی صداقتوں پر ہے، انہوں نے جو کچھ کہا ہے اپنے نفس اور روح میں جذب کر کے کہا ہے۔ شعوری طور پر نہیں لاشعوری طور پر کہا ہے، کسی خاص اہتمام اور تکلف کے ساتھ نہیں بلکہ بے باکانہ اور بے تابانہ کہا ہے بطورِ مثال حمیرا کے مندرجہ ذیل اشعار دیکھئے

میری انگلی کی انگوٹھی میں لگی پتھر کی آنکھ
اور دریچوں میں سمٹ آئی محلے بھر کی آنکھ

میں تو پگلی تھی، مجھے تو تھا ہی رنگوں کا جنوں
قصر میں اُس شخص کے چُندھیائی تھی اکثر کی آنکھ

اُس شب خود آگہی میں آئینے بولا کیے
جیسے پتھرانے لگی خود میرے ہی اندر کی آنکھ

ہم اُسے اپنے لئے محدود سمجھے تھے مگر!
اب کھلا اس چاند پر عرصے سے تھی گھر گھر کی آنکھ

سادگی میں ہم حمیرا جانے کیا کیا کہہ گئے
کس قدر آہستگی سے ہنس پڑی پتھر کی آنکھ

اس قدر غور سے اُس شخص کو دیکھا نہ کرو
وہ بھرے گھر کا ہے عادی اُسے تنہا نہ کرو

گر وہ عادی نہ رہا، دھوپ نہ سہہ پائے گا
چند لمحوں کا کسی شخص پہ سایہ نہ کرو

جب سے اُس دیوار میں روزن ہوئے
جھانکنے والوں کے گھر روشن ہوئے

یہ اب کُھلا کہ اُس کی شاعری میں میری بات کا
جو رنگ خاص تھا مٹا اضافتوں کی سوچ میں

مجھ پہ پہلی سی نظر ڈال کر میرا دامن
تیرے گلشن میں وہی پھول پُرانے مانگے

میں وہ ناکام کہ تھوڑی سی ہنسی کو ترسوں
دل وہ مجبور کہ رونے کے بہانے مانگے

حمیرا کہ ان اشعار میں انسانی جذبے انسانی جذبوں کے رنگ دھنک کی طرح بکھرے ہوئے ہیں اور یہ رنگ کیونکہ نفسیاتِ انسانی اور ہماری روزمرہ کی زندگی سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں اس لئے وہ ہم پر پوری قوت سے اثر انداز ہوتے ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ ان کا اثر قبول کئے بغیر ہم نہیں رہ سکتے اور حمیرا نے بڑی عمدگی سے انسانی جذبات کی ترجمانی کی ہے بطورِ مثال یہاں ان کے چند اشعار پیش کرتا ہوں

اندھیارا بھی اپنے گھر کا کتنا اپنا لگتا ہے
اُس کے گھر سے تو سورج بھی بیگانہ سا لگتا ہے

لہو تو خرچ ہوا تیرے نام لکھنے میں
میری رگوں کیلئے سُرخ روشنائی دے

محبتوں کا ہر اِک پل اُداس کرتا ہے
مگر رگوں میں نئی زندگی بھی بھرتا ہے

یہ تقریر حمیرا رحمان کے شعری مجموعے ''اندمال'' کی تقریبِ رونمائی کے موقع پر 16 اگست 1993 کو کی گئی۔

''رابعہ''، فارسی کی پہلی شاعرہ

جو لوگ فارسی کا ذوق نہیں رکھتے وہ شاید رابعہؔ کے نام سے بھی واقف نہ ہوں لیکن فارسی سے دلچسپی رکھنے والوں کی طرف سے بھی فارسی کی اس قدیم و عظیم شاعرہ کو منظرِ عام پر لانے کی کچھ زیادہ کوشش نہیں کی گئی حالانکہ رابعہؔ فارسی کے قدیم ترین شعراء رودکی شہید بلخیؔ، دقیقی اور ابو شکورؔ وغیرہ کی ہمعصر ہے اور اس کا تعلق خاندان سامانیہؔ کے اس ممتاز دور سے ہے جو فارسی شعر و ادب کا اوّلین دور کہا جاتا ہے۔ سامانیہؔ دور طاہریہؔ اور صفاریہؔ کے خاتمہ پر ۲۹۵ھ سے شروع ہوتا ہے اس میں نہ صرف یہ کہ بڑے بڑے علماء اور فضلا و شعراء پیدا ہوئے بلکہ یہ بھی ہوا کہ ایرانی ادب اپنے قومی و ملکی مزاج سے پہلی بار ہم آہنگ ہوا۔ رابعہؔ اسی عہد سے متعلق ہے اور اس کی ادبی و فنی شخصیت فارسی ادب کے اس ابتدائی دور سے ایسی مستحکم ہو چکی تھی کہ قدیم تذکرہ نگار جو کہ اس وقت عورتوں کا ذکر تو درکناران کا برسرِ عام نام لینا بھی گناہ سمجھتے تھے۔ رابعہؔ کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکے۔ چنانچہ فارسی علم و بیان و قوافی و عروض کی قدیم ترین کتاب المعجم از شمس قیس بن رازی اور فارسی شعراء کے قدیم ترین مستند تذکرہ لباب الالباب مصنفہ عونی میں رابعہؔ کا ذکر آیا ہے اور اس کے کلام کا نمونہ بھی دیا گیا ہے۔ لیکن یہ ذکر مختصر ہے اور اس سے رابعہؔ کے عام حالات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ صاحب لباب الالباب کا بیان ہے کہ

''رابعہ اگر چہ زن و بود اما بفضل یزدان جہان بخندید سے فارس ہر دو میدان دوالی ہر دو بیان۔ برنظم تازی قادر در شعر پارسی لغایت، ہر وبا غایت ذکائے خاطر وحدّت طبع پیوستہ۔ عشق باختے و شاہد بازاری کردے''۔ (لباب الالباب۔ صفحہ ۲۹۴۔ چھاپ طہران مرتبہ سعید نفیسی)

مولانا شبلی نے بھی شعر العجم میں رابعہ کے ذکر میں غیر معمولی اختصار سے کام لیا ہے۔ انہوں نے دور سامانیہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رابعہ کے متعلق صرف اس قدر وضاحت فرمائی ہے:

''اس دور کی یہ خصوصیت یادگار ہے کہ شعر و شاعری کا مذاق عورتوں میں بھی پھیل گیا تھا۔ رابعہ قرداوی بلخی جو رودکی کی ہمسر تھی اعلیٰ درجہ کی شاعر تھی، اس کا باپ کعب اعراب میں سے تھا، لیکن رابعہ عجم میں پیدا ہوئی اور اس وجہ سے عربی، فارسی دونوں میں شعر کہتی تھی۔ نہایت حسین اور صاحب فضل و کمال تھی، یکتاش نام کے ایک غلام سے اس کو عشق تھا، لیکن پھر مجازی سے گزر کر عشق حقیقی تک نوبت پہونچی، چنانچہ اس کا شمار صوفیہ میں کیا جاتا ہے، تاہم چونکہ عورت کا اجنبی مرد سے محبت کرنا اسلامی جماعت میں معیوب تھا۔ اس لئے لوگوں نے اس قتل کر ڈالا''۔

(شعر العجم از شبلی صفحہ ۲۶۔ مطبع معارف اعظم گڑھ)

شبلی کا یہ بیان لباب الالباب سے نہیں بلکہ مجمع الفصحا سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ شبلی نے رابعہ کے قاتل کا سراغ نہیں دیا۔ صاحب مجمع الفصحا کے بیان کے مطابق رابعہ کو خود اس کے حقیقی بھائی نے بر بنائے بدگمانی قتل کیا۔ مجمع الفصحا کی اصل عبارت یہ ہے:

''پدرش کعب در اصل از اعراب بود و در بلخ و قزدار و بست و در حوالی قندھار و سیستان و حوالی بلخ کامرانیہا نمودہ کعب پسرے حارث داشتہ و دخترے رابعہ نام کہ او را زین العرب تیز گفتند، رابعہ مذکورہ در حسن و جمال و فضل و کمال و معرفت و حال و چیدۂ روزگار و فریدۂ دہر وا و دار صاحب عشق حقیقی و مجازی فارس میدان ادبیات فارسی بودہ۔ او را میلے بہ یکتاش نام غلامے از غلامان برادر خود بہ مہر رسیدہ و آنجامش بہ عشق و بدگمانی برادر او کشتہ''۔

(مجمع الفصحا جلد اول صفحہ ۲۲۲)

صاحب مجمع الفصحا نے رابعہؔ کے اشعار بھی نقل کیے ہیں اور اپنی مثنوی گلستانِ ارم کا بھی ذکر کیا ہے جس میں انہوں نے رابعہؔ اور بکتاش کی داستانِ غم نظم کی ہے، فارسی کے مشہور شاعر شیخ فرید الدین عطار کی مثنوی ''الٰہی نامہ'' کا موضوع بھی رابعہؔ اور بکتاشؔ کا عشقیہ قصہ ہے۔ عطار نے پانچ سو اشعار کی طویل مثنوی میں رابعہؔ کی دردناک داستانِ محبت از آغاز تا انجام بڑے فنکارانہ انداز سے نظم کی ہے۔ رابعہ کی داستان کا انداز اگرچہ مجازی معلوم ہوتا ہے لیکن قدیم علماء وفضلا نے رابعہؔ کے عشق کو بالعموم حقیقت پر محمول کیا ہے رابعہؔ کی پاکبازی اور عشق حقیقی کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ مولانا جامی نے اپنی کتاب نفحات الانس میں رابعہؔ کو ان صوفیائے خدارسیدہ میں شمار کیا ہے جو شراب عرفان و حقیقت سے سرشار ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر صفا نے اپنی تاریخ ادبیات ایران میں مشہور صوفی بزرگ ابوسعید ابوالخیر کا یہ قول رابعہ کے متعلق نقل کیا ہے۔

''دختر کعب عاشق بو بر غلامے اما عشق واز قبیل عشق ہائے مجازی نہ بود''

ان مختصر حالات سے رابعہؔ کی شخصیت کی دلکشی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کون ہے جس کے دل میں اس حسین وجمیل صوفیہ۔ فارسی عربی کی نامور شاعرہ اور معشوق عاشق نما مظلومہ کے حالات جاننے کا شوق نہ ہوگا اور کون ہے جو فارسی شاعری کی پہلی ملکہ کی غم بھری داستانِ حسن وعشق سننے کیلئے بیتاب نہ ہوگا لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کی تفصیلی زندگی ہنوز ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے۔ قدیم تذکروں میں مختصر ذکر ملتا ہے دورِ حاضر کے مورخین نے بھی اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ ڈاکٹر شفق نے اپنی تاریخ ادبیاتِ ایران میں اس مشہور شاعرہ کا ذکر تک نہیں کیا۔ رابعہؔ کی داستان پر آقائے عبدالرحمٰن قرامزی نے ''داستان دوستان'' کے نام سے تفصیلی وتحقیقی مقالے تحریر کیے ہیں جن کا خلاصہ ''زنانِ سخنور'' کے

مولف علی اکبر سلیمی نے دے دیا ہے اور سچ پوچھو تو اس آخر الذکر کتاب میں رابعہؔ کے متعلق مختلف جگہوں سے چند ایسی باتیں جمع کر دی ہیں جس کی مدد سے رابعہ کی زندگی کی تفصیلات ہمارے سامنے آتی ہیں۔

رابعہؔ جس کا تعلق چوتھی صدی ہجری سے ہے، قرؔدار میں پیدا ہوئی قردارؔ کا علاقہ اب سے کوئی ہزار سال پہلے افغانستان و پنجاب کے درمیان واقع تھا۔ اس میں ایک قبیلہ آباد تھا جس کے سردار کا نام کعب تھا۔ کعب کے حارث نامی ایک بیٹا اور رابعہؔ نام کی ایک لڑکی تھی جن سے کعب غیر معمولی محبت کرتا تھا۔ کعب کے انتقال کے بعد حارثؔ سلطنت کی جائداد کا وارث ہوا اور اپنی جانشینی کے سلسلہ میں ایک جشن کیا اور تمام رات رقص و سرور میں گزاری۔ اس جشن میں عام و خاص، آقا و غلام بھی شریک تھے۔ حارثؔ کے غلاموں میں ایک غلام یکتاش نامی تھا۔ یکتاش کی چڑھتی جوانی، بھیگی مسیں نشیلی آنکھیں، کشادہ پیشانی اور گھونگر والے بالوں نے اس کے حسن میں چار چاند لگا دیئے تھے، چنانچہ اس شب میں اس غلام نے گھر کی ملکہ رابعہ کو اپنا غلام کر لیا۔ رابعہؔ نے رات بڑی بے چینی سے بسر کی اور صبح ہوتے ہی دایہ کے ذریعے یکتاش کو پیغامِ محبت بھجوایا اس نے جواب دیا کہ وہ پہلے ہی رابعہؔ کے دام محبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ یہ سُن کر رابعہؔ خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ دونوں بہت جلد یک جان دو قالب ہو گئے۔ رابعہؔ، یکتاشؔ کا نظارہ کرتی رہتی اور اپنے کہے ہوئے ترانے گنگناتی رہتی۔ ایک دن یکتاشؔ بیتابانہ حارثؔ کے محل سرا میں داخل ہوا اور رابعہؔ کے دامن پر سر رکھ کر آنسوؤں کے موتی نثار کرنے لگا۔ رابعہؔ نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا ادھر غیب سے ایک آواز آئی کہ یکتاشؔ تو محبت میں اپنے آپ کو اس طرح جلا کر خاک کر کہ حقیقت سے قریب تر ہو جائے۔

حارث کو رابعہ اور غلام کے ان گہرے روابط کی خبر نہ تھی لیکن کچھ دنوں بعد حارث کو اس کا پتہ چلا گیا، جس سے وہ بہت بدگمان ہوا، ہر چند کہ باپ نے مرتے وقت رابعہ کو ہر طرح سے خوش رکھنے کی نصیحت کی تھی۔ لیکن حارث اسے فراموش کر کے یکتاش کے درپے آزار ہو گیا۔ حتیٰ کہ ایک روز وہ دشمنوں کے مقابلے کیلئے اپنے غلام یکتاش کو بھی ساتھ لے گیا۔ یکتاش بُری طرح زخمی ہوا اور بظاہر اس کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ لیکن یکتاش کی عاشق رابعہ نے اس کی جان بچالی اور اسی طرح دشمنوں کے نرغے سے نکال کر اسے گھر لائی۔ حارث کو جب معلوم ہوا تو اس کے غصے کی کوئی انتہا نہیں رہی اور رابعہ سے ہمیشہ کیلئے دل گرفتہ ہو گیا۔ ادھر رابعہ کی نیند حرام ہوئی اور وہ غم سے نڈھال ہونے لگی آخر کار اس نے اپنے دل کا چور اپنے بھائی پر صاف طور پر ظاہر کر دیا لیکن ابھی غیروں کو اس کی خبر نہ ہوئی تھی۔ ایک دن رودکی کی نظر اتفاق سے رابعہ پر پڑی رابعہ سے اس نے ترانہ سُنا اور بھانپ گیا کہ رابعہ کسی کی محبت میں گرفتار ہے چند دن گزر گئے ایک دن امیر نصر شہریار کے دربار میں علماء وفضلاء جمع تھے امیر نے اشعار سُنانے کی فرمائش کی، رودکی نے چند ترانے سنائے جن کے آخر میں رابعہ کا نام بطور تخلص آیا تھا۔ امیر اشعار سُن کر پھڑک اُٹھا اور رابعہ سے ملاقات کرنے کا مشتاق ہوا۔ رودکی نے جواب دیا کہ وہ ایک شاہد بازاری ہے اور ایک غلام پر عاشق ہے۔ حارث خود بھی اس مجمع میں موجود تھا۔ اسے رودکی کا یہ طنز ناگوار گزرا اور وہ دوڑا ہوا گھر آیا اور یکتاش کو ایک کنویں میں قید کر کے رابعہ کو گرم حمام میں ڈال دیا۔ رابعہ اپنے خون سے حمام کے در و دیوار پر ترانے لکھتی رہی جب یکتاش کو رابعہ کی تکلیف کی خبر پہونچی تو وہ قید سے فرار ہو کر حمام پہونچا لیکن اسے پہونچے میں کافی دیر ہو چکی تھی اور اس کی محبوبہ اس اثناء میں اس سے ہمیشہ ہمیشہ

کیلئے جدا ہوگئی تھی۔ یکتاش اس خبر جانکاہ سے ہوش وحواس کھو بیٹھا۔ حارث کو قتل کر کے محبوبہ کے خون کا بدلہ لیا۔ اوراس کے بعد خود بھی دنیا سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہوگیا۔

یہ ہے رابعہ کی داستانِ عشق جو ایک المیہ ہے اور جسے سُن کر ہم رابعہ کے استقلال ہمت، ایثار اور حقیقی جذبہ محبت کے قائل ہو جاتے ہیں۔ مولانا جامی اور مولانا ابوسعید الخیر نے اسی لئے رابعہ کو صوفیوں کے گروہ میں شامل کیا ہے۔ رابعہ نے جس خندہ پیشانی سے طلب حقیقت میں اپنی جان قربان کی ہے۔ اس کی مثال سرمد و منصور کے سوا اور کہاں مل سکتی ہے۔ لیکن رابعہ صرف ایک صوفی منش برگزیدہ عورت ہی نہ تھی بلکہ اپنے وقت کی ایسی عالم وفاضل شاعرہ تھی جس کی مثالیں تاریخ میں خال خال ملتی ہیں۔ رابعہ کے معاصر شعراء اور قدیم تذکرہ نگاروں نے اس کے علم وفضل اور فصاحت وبلاغت اور زباندانی کا ہر جگہ ذکر کیا ہے۔ رابعہ نے یہ اعلیٰ تعلیم کہاں اور کس سے حاصل کی ہے۔ اس کا سراغ نہیں ملتا۔ کسی کتاب میں رابعہ کے کسی استاد کا ذکر بھی نہیں آیا۔ جس سے اس کے ذرائع تعلیم کے متعلق کوئی رائے قائم کی جاسکے۔ رابعہ کا خاندان بھی کچھ ایسے بڑے حکمرانوں کا نہ تھا کہ اس کا ذکر کوئی مورخ اپنا فرض خیال کرتا۔ اُس وقت مشرق میں تاریخ نگاری، کا فن صرف حاکم اعلیٰ اوراس کے متعلقین ولواحقین کے ذکر تک محدود تھا عورت کو گھر کی چہار دیواری سے نکلنے کی اجازت نہ تھی، اسے سماجی زندگی میں کوئی باوقار مقام بھی حاصل نہ تھا۔ کسی عورت پر نظر ڈالنا یا برسرِ عام اس کا نام لینا سخت گناہ تھا۔ رابعہ اس ماحول کی پروردہ تھی۔ ظاہر ہے کہ اسی صورت میں رابعہ کے حالاتِ زندگی کسی کتاب میں کیونکر آسکتے تھے۔ وہ چونکہ ایک متمول گھرانے کی پردہ نشین خاتون تھی اس لئے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے

قدیم رؤسا اور امراء کے خاندانوں کی طرح گھر ہی میں اعلیٰ تعلیم پائی ہوگی اور اسے شعر و ادب کا ذوق خود اپنے گھر کی فضا اور باپ کی تربیت سے ملا ہوگا۔ تمام علمائے ادب کا اس امر پر اتفاق ہے کہ رابعہ فارسی کی پہلی قابلِ ذکر شاعرہ ہے یہی نہیں بلکہ وہ فارسی ادب کے معماروں اور محسنوں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے۔ اس نے اس وقت فارسی میں شعر گوئی شروع کی جب فارسی اپنے مقامی رنگ میں پہلے پہل ایران کی سرزمین میں قدم جما رہی تھی۔ صاحب لباب الالباب نے رابعہ کے کلام کو شیرینی و فصاحت سے مملو بتایا ہے اس کے کلام میں تکلف و تصنع یا رسمی باتوں کا ذکر نہیں بلکہ آپ بیتی کی جھلک ہے اسی لئے اس میں حسن واثر و ز ور تینوں چیزیں موجود ہیں ہم یہاں چند اشعار بطور نمونہ نقل کر رہے ہیں ان سے رابعہ کی شاعرانہ شخصیت کے متعلق رائے قائم کرنے میں براہ راست مدد ملے گی۔

نعیم بے تو نہ خواہم جحیم باتو واست
کہ بے شکر نہ زہراست باتو زہر عسل

الا اے باد شب گیری پیام من بہ دلبر بر
بگو آن ماہِ خوبا نراکہ جان بادل برابر بر

دوش برشاخکِ درخت آں مرغ
نوحہ می کردو می گریست بزاری
من جدایم نہ یار آزاں می نالم
توچہ نالی کہ بامساعدے یاری

عشق او باز اندوا ودم بہ بند
کوشش بسیار نیاید سود مند
تو سنی کردم ندا نستم ہمی!
کز کشیدن سخت تر گرد و کمند
زشت باید دید و انگار ید خوب
زہر باید خورد و پنداریدقند

دعوت من بر توآں شد کا یزدت عاشق کناد
بر یکے سنگین دے نا مہرباں چوں خوشتین

تابدانی درد و عشق داغ ہجر و غم کشی
چوں بہ ہجر اندر بہ پیچی پس بدانی قدر من

رابعہ عربی کی بھی کامیاب شاعرہ تھی۔ اس کے فارسی کلام میں عربی الفاظ، ترکیبیں اور فقرے بکثرت استعمال ہوئے ہیں فارسی کے ایسے اشعار بھی تذکروں میں ملتے ہیں۔ جن میں ایک مصرعہ فارسی اور دوسرا عربی ہے۔ ان امور سے رابعہ کی قدرت زبان و کلام کا اندازہ ہوتا ہے اور ہمیں ڈاکٹر صفا کی اس رائے کی تائید کرنی پڑتی ہے کہ ''سخن اودر لطافت واستعمال بر معانی دل انگیز وفصاحت وحسنِ تاثیر معروف است''

رشیدہ سلیم سیمیں کی شاعری

رشیدہ سلیم سیمیں شاعرہ کی حیثیت سے کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ اُردو کی شاعرات میں وہ ممتاز حیثیت رکھتی ہیں اور ان کی شاعری کا لب ولہجہ شعروادب کے قارئین کیلئے اجنبی نہیں مانوس اور جانا پہچانا ہے۔ ان کا مجموعہ کلام ''چشم خوں بستہ'' کے عنوان سے منظرِ عام پر آیا ہے۔ یہ ایک ایسا عنوان ہے جو میر تقی میر کے اس شعر کی یاد دلاتا ہے۔

چشمِ خوں بستہ ہے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم یہ سمجھے تھے کہ اے میر یہ آزار گیا

اس عنوان سے عشقیہ شاعری کی تمام علامتیں واضح ہو کر سامنے آجاتی ہیں اور یہی علامتیں میر تقی میر کی طرح رشیدہ سلیم سیمیں کی شاعری میں بھی جا بجا نمایاں ہیں۔ غزل کی خوبی یہی ہے کہ اسے ظاہر میں سادہ اور باطن میں پُرکار ہونا چاہیے۔ لیکن غور کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ رشیدہ سلیم کی شاعری بھی سادگی اور پُرکاری کی عمدہ مثال ہے۔

ان کی غزلوں کا لہجہ غزل کے مزاج کی طرح حد درجہ مترنم، نرم اور سبک وشیریں ہے۔ ایسا سبک وشیریں جو مطالعہ کے ساتھ ساتھ اَن جانے طور پر قاری کے ذہن ودل میں اُترتا چلا جاتا ہے اور یہ ان کے کلام کی ایسی خصوصیت ہے جو برسوں کی ریاضت اور شعر سے طبعی مناسبت کے طفیل وجود میں آتی ہے۔ چند اشعار بطور مثال دیکھئے۔

شام آتی ہے تو دل ڈوب کے رہ جاتا ہے
رات بھر راہ دکھاؤ گے کہاں آؤ گے

گرفتہ دل تھے بہت روئے یاد کر کے تجھے
تمام رات نہیں سوئے یاد کر کے تجھے

زندگی شب کے مسافر کی طرح تنہا ہے
یاد کے دیپ ابھی راہ میں جلنے دیتے

ذرا جو سامنے آؤ تو چاند روشن ہو
ترس گئے ہیں در و بام چاندنی کیلئے

رات پھر رات ہے مگر سیمیں
دن بھی گزرا ہے رات ہی کی طرح

لوگ راہوں میں کھڑے تھے سیمیں
اِک نظر مڑ کے تو دیکھا ہوتا

یہ اور اس طرح کے دوسرے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی غزل گوئی بظاہر روایتی ہوتے ہوئے بھی روایتی نہیں ہے۔ اس میں جدت، تنوع اور روایت شکنی کی خوشگوار فضا ملتی ہے اور یہی فضا رشیدہ سلیم سیمیں کے شاعرانہ لے کو ایک طرح کی انفرادیت بخشتی ہے۔

رشیدہ عیاں، قادر الکلام شاعرہ

میں نے کسی جگہ لکھا ہے کہ ''شاعری کی بہت سے تعریفیں کی گئی ہیں، لیکن مختصر ترین لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ''شاعری'' شخصیت کا منہ بولتا رُوپ ہے۔ شخصیت جتنی شائستہ و نفیس اور سنجیدہ و متین ہوگی اس کا منہ بولتا روپ اتنا ہی لطیف و متین اور سنجیدہ و نفیس ہوگا''۔ مجھے رشیدہ عیاں کی شخصیت اور شاعری میں یہ تعلق واضح طور پر نظر آتا ہے۔

بات یہ ہے کہ شاعری خواہ اس کا فنی معیار اور سانچا کچھ بھی ہو، گرد و پیش کی زندگی اور شاعر کے ذہنی و حسی تجربات سے الگ نہیں ہوسکتا، اس کا رشتہ، شاعر کے ذاتی اور عصری میلانات سے بہت مربوط ہوتا ہے۔ اس رشتے کے اظہار کیلئے کہیں تمثیلی و استعاراتی کہیں پیچیدہ و مبہم اور کہیں سادہ و واضح، خوبصورت لفظی پیکر تراشنے پڑتے ہیں۔ لیکن یہ سب پیکر شاعر کے ذاتی تجربات و مشاہدات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

اس خاص نقطہ نظر سے جب رشیدہ عیاں کے کلام پر نظر ڈالتا ہوں تو صاف اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی غزلیں اور نظمیں اپنے اندر ایک خاص قسم کی معنویت رکھتی ہیں۔ یہ معنویت حسن و محبت کے جھوٹے جذبوں سے نہیں بلکہ ملک و ملت کے گہرے مسائل سے تعلق رکھتی ہے۔ ظاہر میں بات تو ہوتی ہے گل و بلبل کی لیکن اصل مقصود کچھ اور ہوتا ہے۔ چنانچہ رشیدہ عیاں کے کلام میں زندگی کا جو شعور اور گرد و پیش کے حالات کا جو احساس ملتا ہے وہ ان کے مشاہدات و تجربات ہی پر مبنی ہوتا ہے۔ مثال میں ان کا یہ شعر دیکھئے۔

سچائی کے اصول پہ جب سے اڑی ہوں میں
سنسان دشت زیست میں تنہا کھڑی ہوں میں

اسی قبیل کے چند اشعار اور دیکھئے:

ننھے ننھے ہاتھوں میں جب بھیک کا کاسہ دیکھوں میں
دیر تلک میں ہاتھ سمیٹے خالی جیب ٹٹولوں ہوں

مکان ٹوٹے ہوئے اور مکیں دریدہ بدن
یہ میرے جیسے حالات جا بجا کیوں ہیں

حصارِ ذات سے باہر نکل کر جب دیکھا
تو اپنے غم سے فزوں دوسروں کے غم نکلے

رشیدہ عیاں کی شاعری کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک خیال اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ان کی شاعری اس عہدِ خاص سے تعلق رکھتی ہے جو ان کا اپنا عہد ہے۔ جس میں انہوں نے آنکھ کھولی، پروان چڑھیں اور شعور کو پہنچی ہیں۔ گویا ان کی شاعری لفظ و بیان اور فکر و احساس کی ہر سطح پر ایک واضح شناخت رکھتی ہے۔

اگر چہ رشیدہ عیاں کی شاعری میں فکری توانائی کے آثار بھی ملتے ہیں لیکن اس سے بڑھ کر یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ان کے یہاں جذباتی و نفسیاتی توانائیاں اور سچائیاں بھر پور انداز میں رونما ہوتی ہیں۔ ایسی توانائیاں اور ایسی سچائیاں جو بذاتِ خود بھی دلکش ہیں اور شاعرہ نے انہیں خوبصورت لفظی پیکر دے کر اور بھی دل آویز و کارگر بنا دیا ہے۔

چند اشعار دیکھتے چلئے:

میں اپنے آپ کو پہچاننے سے قاصر ہوں
یہ کس کے جسم پر چہرا لگا دیا میرا

بے سبب آنکھ سے کب اشک رواں ہوتا ہے
گیلی لکڑی ہوں سلگتی ہوں دھواں ہوتا ہے

تمام عمر حنا بیچتا رہا لیکن
خود اپنی بیٹی کے پیلے نہ ہاتھ کر پایا

کم اجرتوں پہ لوگ رضامند ہوگئے
کیسا شکم کی آگ نے لاچار کر دیا

اے اہلِ ستم ٹوٹنے والے نہیں ہم لوگ
پتے تو بکھر سکتے ہیں پر شاخ ہری ہے

یہ اشعار ہماری تہذیبی وسیاسی شکست وریخت کی تاریخ کی حیثیت رکھتے ہیں اور فنی تخلیق کے ہر معیار پر پورے اُترتے ہیں۔

رشیدہ عیاں کا پورا نام سیدہ رشیدہ بیگم ہے۔ ان کا آبائی وطن مراد آباد (یوپی) ہندوستان ہے۔ رشیدہ عیاں کے شوہر سید شمیم حیدر مشہور صحافی تھے، دونوں کا زیادہ وقت امریکہ میں گزرا اور بہت کامیاب وخوشگوار گذرا شمیم حیدر نے رشیدہ عیاں کی ادبی زندگی کو بارآور بنانے میں ہر طرح مدد کی۔ جب تک رہے رشیدہ عیاں کا بہت خیال رکھا البتہ شمیم حیدر کی قبل از وقت وفات نے انہیں نڈھال کر دیا۔ پھر بھی وہ ذہنی طور پر فعال رہیں اور اپنے کلام کو یاسیت کا شکار نہیں ہونے دیا۔ ان کے ذہن وقلم سے زندگی کے رجائی زاویہ نظر کو پوری طرح اپنائے رکھا اور وہ دیارِ غیر میں رہ کر بھی اپنے دیار کے گیت گاتی رہیں۔

رشیدہ عیاں کے بارے میں متعدد تعارفی و تنقیدی مقالات و مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ پروفیسر رعنا اقبال صاحبہ نے ''رشیدہ عیاں شخصیت و فن'' کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کر کے شائع کر دی ہے۔

ریحانہ روحی کے شعری مجموعے ''اور میں تنہا بہت''

پر سرسری نظر

''اور میں تنہا بہت'' ریحانہ روحی کا دوسرا مجموعہ کلام ہے۔اس میں چند نظموں کے سواء تمام غزلیں ہیں۔اپنی موجودہ شاعری کے بارے میں روحی ایک جگہ خود لکھتی ہیں کہ!

''میرا قلم بے باک اور میری شاعری سفاک ہوتی جارہی ہے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے کہ مجھ کو ملنے والی اکیسویں صدی کی یہ دنیا اس وقت جس بے پناہ فکری انتشار سے گزر رہی ہے اس نے ہر ذی شعور کو ڈسٹرب کر دیا ہے اور ادب تو ہے ہی ماحولیاتی نظام کی نفسیاتی حرف گری کا نام ......آنکھیں جو دیکھیں گی، دل پر جو گزرے گی، احساس پر جو بیتے گی اور ذہن جو محسوس کرے گا وہی تو لکھا جائے گا نا......سو اب شاعری میں پہلے والی جمالیات کا تناسب کم ہوا اس میں میرا کیا قصور......؟

نتیجتاً ریحانہ روحی کے اس شعری مجموعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے گرد و پیش کے حالات اور سماجی مسائل سے بہت گہرا اثر قبول کرتے ہوئے اپنے شعور واحساس اور مشاہدات و تجربات کو بڑی فنی مہارت کے ساتھ شاعری کے قالب میں ڈھالا ہے۔مثلاً چند شعر دیکھیے:

فیصلہ مشکل ہے روحی دوست اور دشمن میں اب
ساری دنیا شعبدہ گر اور میں تنہا بہت

اب تو بیٹے بھی چلے جاتے ہیں رخصت ہوکر
صرف بیٹی ہی کو مہمان نہ سمجھا جائے

سب اپنے واسطے ہی فکر مند ہیں روحی
یہاں کسی کو کسی کا خیال تھوڑی ہے

تو زمینوں پہ اُتر کر جو گزارے اک دن
آسمانوں کے خدا تجھ کو بھی حیرت ہوجائے

یہ دنیا قابلِ صد رشک ہوتی جارہی ہے
مگر انسان بے توقیر ہوتا جا رہا ہے

لوگوں میں مصلحت کا چلن عام ہوگیا
چہروں پر اب دِلوں کے تراجم نہیں رہے

ان اشعار میں حُسن وعشق کے قصوں اور ہجر ووصال کے افسانوں کے بجائے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسانی معاشرے اور سماج میں بگڑتے ہوئے حالات، انسانی فکر اور رویوں میں رونما ہونے والی غیر متوقع منفی تبدیلی اور اخلاقی وتہذیبی روایات اقدار کی شکست وریخت کے نتیجے میں زندگی، معاشرے اور ماحول میں پیدا ہونے والے علمی وفکری تہذیبی وتمدنی انحطاط وزوال سے شدت کے ساتھ متاثر ہوئے اور پھر ان تمام مشاہدات و تجربات اور محسوسات کو بڑے دکھ، کرب اور شدت احساس کے سہارے بڑے پُر تاثیر

شعری انداز میں بیان کرنے کے رجحان نے شاعری میں عصری آگہی کا رنگ بھر کر اسے قاری کے دل اور ذہن سے اور بھی قریب کر دیا ہے اور یہی ان کی شاعری کی کامیابی کا اصل راز ہے۔ مثلاً ان کا یہ شعر دیکھئے:

ایسا چراغ میں نے جلایا نہیں کبھی
جس میں کہ خود لہو مرا شامل نہیں رہا

زیر نظر شعری مجموعہ کے مطالعے کے بعد ہم ان کی کہی ہوئی بات کی سچائی کے قائل ہو جاتے ہیں۔

ریحانہ روحی کے شعری مجموعے میں ہمیں ایسے بھی بہت سے اشعار مل جاتے ہیں جن کو مضمونِ آفرین، تخیل کی کرشمہ سازی، نازک خیالی اور شاعرانہ حُسن کی دل کشی و دل نشیں مثالیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ لفظوں کا انتخاب اور ان کو برتنے کا عمل ہو یا اندازِ بیان کی تاثیر، موضوعات کا تنوع ہو یا مضامین کا اچھوتا پن ہر جگہ ان کی شاعرانہ صلاحیت اور فنی مہارت نمایاں ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

پیروں کو کاٹ دیا ہے اڑان سے پہلے
یہ خوفِ ہجر ہے شوقِ وصال تھوڑی ہے

وہی نظارۂ حیراں میں گم چشم تماشائی
وہی آئینہ حیرت اور اس کے بیچ میں دنیا

مری تخلیق میں شامل ہے دل داری کا منصب
میں عورت ہوں سنور جانے کو گہنا چاہتی ہوں

ٹھہراؤ جیسے آگیا سطحِ جنون پر
جب کربِ انتظار سے آگے نکل گئے

میں اس کو خواب تک محدود رکھنا چاہتی تھی
مگر وہ خواب کی تعبیر ہوتا جارہا ہے

ہم اپنی فضا خود ہی بنا لیتے ہیں روحی
موسم کو یہ احسان اُٹھانے نہیں دیتے

جب انحصار سفر کا ہے بادبانوں پر
تو بادبان کنارا بدل بھی سکتے ہیں

آج کی اردو شاعرات میں ریحانہ روحی ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ان کی شاعرانہ فکر، جذبوں کی سچائی، مشاہدات ومحسوسات کا پُر تاثیر بیان اور اسلوب کی ندرت ان کے شعری مرتبے کو بلند تر کرتی جارہی ہے اور وہ قبولِ عام کی طرف تیزی سے قدم بڑھارہی ہیں۔

ز۔خ۔ش، اُردو کی پہلی انقلابی شاعرہ

ز۔خ۔ش۔زاہدہ خاتون شروانی کا مخفف ہے۔ ایک مدت تک ہمارے پڑھے لکھے طبقے کو بھی یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کیا تھیں اور کون تھیں اور ہماری شعری تاریخ میں ان کیا مقام تھا؟ یہ ۱۹۸۵ء کی بات ہے کہ اُردو لغت بورڈ کے کتب خانے میں ان کا دیوان ''فردوس تخیل'' میری نظر سے گزرا اور مجھے شاعرہ نے اپنا گرویدہ بنالیا۔ ایک زمانے میں پاکستان ٹیلی ویژن پر کسوٹی کے پروگرام کا بڑا چرچا تھا۔ اس پروگرام کو عبید اللہ بیگ اور افتخار عارف وغیرہ کی وجہ سے خاصی شہرت حاصل ہوگئی تھی۔ اس پروگرام میں میں نے دو دفعہ ز۔خ۔ش کو پوچھا مگر مبصرین صحیح جواب نہ دے سکے۔ بعد میں ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا اور۔ز۔خ۔ش پوری طرح بطورِ شاعرہ کے ہمارے سامنے آگئیں۔

زاہدہ خاتون شروانیہ (ز۔خ۔ش) کا تعلق بھیکم پور یوپی بھارت کے مشہور شروانی خاندانی سے تھا۔ ان کے والد نواب سر مزمل اللہ خاں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ حکومت سے طرف سے ''خان بہادر'' کا خطاب بھی پائے ہوئے تھے۔ زاہدہ خاتون شروانیہ کی ولادت دسمبر ۱۸۹۴ء میں ہوئی اور ۴ فروری ۱۹۲۲ء کو وہ دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ اتنی کم عمری میں بھی وہ شاعری کے میدان میں اپنے یادگار نقوش چھوڑ گئیں

زاہدہ خاتون شروانیہ نے اپنی ذاتی محنت اور ذہانت سے شعر گوئی کا آغاز کیا۔ چنانچہ ان کا یہ شعر اس بات کی گواہی دیتا ہے

بے فیض تلمذ ہوئی استاد سخن میں
یہ فخر ہے اس اخترِ خود ساز سے مختص

اردو شاعری کی تاریخ میں ترقی پسندانہ خیالات کی ترجمانی کے حوالے سے ان کا وہی مقام ہے جو اردو افسانے میں ڈاکٹر رشید جہاں کا ہے۔ لیکن اردو ادب کو نئے خیالات دینے کے سلسلے میں ز۔خ۔ش کو ڈاکٹر رشید جہاں پر تقدم حاصل ہے۔ صرف اس وجہ سے نہیں کہ وہ ترقی پسند رجحان کی مُبلّغ تھیں بلکہ اس لئے بھی کہ زخ ش نے جس سخت گیر ماحول میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور سماجی زندگی سے بغاوت کر کے اور ایک خاتون خانہ ہو کر بھی ایسے افکار و خیالات کو موضوع سخن بنایا جو ان سے پہلے اردو شاعری میں نہیں ملتے۔

ز۔خ۔ش جہاں مشرقی اوضاع و اطوار کا نمونہ تھیں وہیں روشن خیالی، وسیع القلبی، حریتِ فکری اعلیٰ وارفع ترقی پسندانہ نظریات سے وابستگی بھی ان کی دیگر نمایاں خصوصیات ہیں جو ان کی شاعری میں بھی واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ سلاست و بلاغت اور کیف و تاثیر ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں ہمیں مضامین و موضوعات کے تنوع کے ساتھ ساتھ عصری آگہی اور اپنے گرد و پیش کے مسائل سے آشنائی کے ساتھ ساتھ وہ خاص شعور و احساس بھی بطورِ خاص نظر آتا ہے جسے ہم نسائی شعور و احساس کا نام دے سکتے ہیں۔ مثلاً ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

نظم کا عنوان ہے ''مہذب بہنوں سے خطاب'' کہتی ہیں:

مل جائے گا خدا تمہیں شوہر کی چاہ سے
سمجھو ذرا حقیقت عشقِ مجاز کو
پوشیدہ اپنے عیب کی صورت رکھو اسے
شوہر کا راز سمجھو نہ شوہر کے راز کو

قصّے کہو نہ طفل سے ابطال غرب کے
ازبر کراؤ سیرتِ شاہِ حجاز کو
مطبخ میں جا کے خود بھی پکایا کرو کبھی
پیچھے ہٹو نہ سونگھ کے لہسن پیاز کو
برباد کن ہے ایسی قمیصِ گراں بہا
ہے اس پہ فوق پیرہنِ خانہ ساز کو

ایک نظم جس کا عنوان ہے ''تتلی'' چند اشعار دیکھئے

جانتے بھی ہو تتلی کیا ہے
یہ اک عشقِ حُسن نما ہے
صانع کی ایک صنعت زریں
عاشق کا اک نامہ رنگیں
ایک نیازِ استغنا کش
ایک سکوتِ شورشِ زا ہے
ایک مشکل آہِ سوزاں
اک متحرک اشکِ خونیں
ایک طلسمی نقش کشیدہ ہے
ایک مصورِ علمی جریدہ
شوخیِ فطرت کا آئینہ
دردِ محبت کا گنجینہ

ایک ایسے زمانے میں جب مسلمانوں کے شریف گھرانوں میں عورتوں اور خاص طور پر لڑکیوں کی تعلیم کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا محترمہ ز۔خ۔ش نے نہ صرف تعلیم حاصل کی بلکہ اپنا نام بدل کر شاعری بھی کی اتنی کم عمری میں اس قدر معیاری، عمدہ اور پُر اثر شاعری ان کی بے پناہ تخلیقی قوت وصلاحیت کی غماز ہے۔

سعدیہ روشن صدیقی، روشن مستقبل کی شاعرہ

سعدیہ روشن صدیقی بحیثیت شاعر محتاجِ تعارف نہیں رہیں۔ پاک و ہند سے دور سات سمندر پار کی دنیا میں جہاں جہاں اُردو زبان وادب کا ذوق رکھنے والے بستے ہیں سعدیہ روشن صدیقی کو نہ صرف اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں بلکہ ان کے فکروفن کو قدر کی نگاہ سے بھی دیکھتے ہیں۔

سعدیہ روشن صدیقی کے فکروفن کی سب سے نمایاں اور منفرد خصوصیت یہ ہے کہ وہ دور کی کوڑی لانے کی کوشش میں خواب وخیال کی باتیں نہیں کرتیں بلکہ اپنے آس پاس کی فضا میں جو کچھ دیکھتی ہیں اور محسوس کرتی ہیں اسے دلآویز پیکروں میں بے باکی سے بیان کر دیتی ہیں چند اشعار دیکھئے۔

اپنے سب مسائل تو حل نہ کرسکے ہم لوگ
طے ہمارے بچوں کا مسئلہ کیا جائے

مجھ میں اور رقیبوں میں درد مشترک تو ہے
ورنہ کس حوالے سے رابطہ کیا جائے

تند و تیز دھارے میں بہہ رہے ہیں تنکے سے
اب انہی سہاروں کا غلغلہ کیا جائے

نقد جاں لٹائیں تو اپنا سر کٹائیں تو
روشنی بڑھانے کا سلسلہ کیا جائے

سعدیہ روشن صدیقی کی شاعری کا دوسرا نام محسوساتی واقفیت اور جذباتی صداقت ہے۔ ہر شاعر نے حالات کو اپنی آنکھ سے اپنے اپنے تجربات کی روشنی میں دیکھا ہے، کسی کے قلب و ذہن پر حالات حاضرہ کی ناسازگاری نے ناخوشگوار اثر ڈالا ہے اور شکوہ و شکایت کے ساتھ بزدلانہ ذہنی کیفیت سے ہم کنار کیا ہے لیکن انہی حالات نے بعض کو جینے کا حوصلہ بخشا ہے اور زندگی کے باب میں رجائی نقطہ نظر کا حامل بنا دیا ہے۔ سعدیہ روشن کی شاعری بحیثیت مجموعی حیات افروز خیالات کا مرقع ہے۔ چند اشعار دیکھئے۔

ایک لمحے کو تازہ ہوا جو چلی عمر بھر کی گھٹن کا خیال آ گیا
لاکھ مشکل سہی ضبط کرنا مگر اب تو خاصا ہمیں یہ کمال آ گیا

جتنی کلیاں کھلیں جتنے تارے کھلے اس کی آمد کے سب استعارے کھلے
جب تصور کے دامن میں کچھ نہ بچا میرے پہلو میں وہ بے مثال آ گیا

بات بے بات کج بحثیاں بھی گئیں وہ پرانی شکر رنجیاں بھی گئیں
اب نئی شاخ پھوٹی ہے دل میں مرے غم کا تازہ بتازہ نہال آ گیا

سعدیہ اپنے وطن سے باہر دنیا کے کسی گوشے اور کسی ماحول میں رہیں اپنے مُلک و ملّت کی ثقافتی فضا اور تہذیبی زندگی کو اپنی نظروں میں ہمہ وقت سجائے رکھتی ہیں چنانچہ عام معاصر شعراء کے برعکس انہوں نے اپنے دینی و ملّی ورثے کے چاند تارے، استعارات و کنایات کی صورت میں ردائے شاعری میں اس طرح ٹانک دیئے ہیں کہ ان کی شاعری کی فضا ہم عصر شاعری سے بہت الگ ہو گئی ہے۔ اتنی الگ کہ ہم شاعروں کے بڑے ہجوم میں

بھی آسانی سے پہچان لیتے ہیں۔ میرے نزدیک پیکر تراشی کے باب میں یہ روش، سعدیہ روشن کے یہاں ایک انقلابی رجحان ونشان کی حیثیت رکھتی ہے اور سعدیہ روشن کی نظم وغزل اورنثر سب میں نمایاں ہے، تب ہی تو خود بھی کہتی ہیں

نظم و نثر جو بھی ہے منفرد ہی ہے
شعر ہی نہیں کہتی انقلاب لکھتی ہوں

ایک اور نظم دیکھتے چلئے۔

اگر قطرہ سمندر ہے
اگر ذرہ بھی صحرا ہے
اگر پتہ بھی جنگل ہے
تو کیا میرا مقدر ہے؟
مگر یہ بھی تعین ہو
کہ اپنی شخصیت کیا ہے
تعارف گر ہو دوبارہ
تو اپنی حیثیت کیا ہے
سمندر بوند بن جائے
زرِ صحرا بکھر جائے
ہماری ذات کا جنگل
سراپا آگ بن جائے
ہر اک منظر بدل جائے
مگر ہم خود نہ بدلیں گے

اُوپر کے اشعار میں جو کچھ کہا گیا ہے محض یہ نہیں کہ وہ سعدیہ روشن صدیقی کی تعلّیات ہیں یا ایک اُبھرتے ہوئے فن کار کے اِعادّت ہیں بلکہ حقیقت طرازی اور کائنات کے ساتھ ساتھ خود شناسی کی تمثیل ہیں۔

سحر علی، باحوصلہ شاعرہ

''تمہارے غم کے موسم میں'' ایک ایسا شعری مجموعہ ہے جسے دکھے ہوئے دل کی آواز کہنا زیادہ مناسب ہوگا ایک ایک غزل اور ایک ایک نظم سے شاعرہ کی دل گدازی اور غم انگیزی کا اندازہ ہوتا ہے۔سحر علی بہت کم عمری میں اپنے شریکِ حیات عشرت علی کی رفاقت سے محروم ہوگئیں۔زندگی کی خوش گوار بہاریں تو کم میسر آئیں البتہ شوہر کی وفات کے بعد غم وآلام کے بادلوں نے انہیں آغوش میں لے لیا۔ان کی زندگی کا موسم مستقلاً غم کے موسم میں بدل گیا۔

سحر علی کی شاعری غم واندوہ سے عبارت ہونے کے وصف فکر انگیز ہے اور اپنے پڑھنے والوں کو غم زدہ ہونے کے بجائے زندہ رہنے کا حوصلہ بخشتی ہے۔ان کے جذبوں کی صداقت ان کے ایک ایک لفظ سے نمایاں ہے۔مجموعہ کلام میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی ہیں۔نثری نظمیں بھی ہیں اور قطعات بھی، لیکن جیسا کہ کہا گیا ہے کہ ان کے کلام میں جو کچھ بھی ہے غم آلود ہونے کے باوجود فکر انگیز ہے۔سرورق پر دیئے ہوئے دو شعر سحر انگیزی کے حد تک پُرتاثیر ہیں۔ معاملاتِ محبت کو وہ کس طرح محسوس کرتی ہیں اور ہجر و وصال کی ناہمواریوں سے کس طرح آنکھیں ملا کر آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتی ہیں اس کی پرچھیاں پورے مجموعہ کلام میں صاف نظر آتی ہیں۔پھر بھی ایک مختصری غزل دیکھتے چلئے۔

ذرا پہلے میرے بگڑی ہوئی تقدیر بننے دے
پھر اس کے بعد تو خود کو میری جاگیر بننے دے
نہیں اس کے سواء کوئی تمنا دوسری دل میں
اپنے خواب کی مجھ کو حسین تعبیر بننے دے

ستم کی گھٹا میں بیٹھی ہوئی دنیا سے ڈرتی ہوں
تجھے میں کس طرح پاؤں کوئی تدبیر بننے دے
شکستہ آرزوں بن کر تری دھڑکن میں کیا رہنا
تو اپنے دل کی بستی کو مری جاگیر بننے دے
تیری دل کی حکایت بھی زمانے بھر میں گونجے گی
سحر تو اپنے جذبوں کو زبانِ میر بننے دے

سحر علی کی غزلیں ان کے فکر وفن کا پورا احاطہ کرتی ہیں۔ انہوں نے بڑی سادگی اور خوبصورتی سے اپنے جذبات و احساسات کو اشعار کی صورت میں قاری کے سامنے پیش کردیا ہے۔

شاہدہ حسن، حرارت وحرکت اور روشنی کی پیامبر

شاعری فنونِ لطیفہ کی سب سے اہم اور لطیف شاخ ہے، اہم اس لئے کہ انسان کی معاشرتی وتہذیبی زندگی پر جتنے گہرے اثرات شاعری نے مرتب کئے ہیں فنون لطیفہ کی کسی اور شاخ نے نہیں کئے۔ لطیف اس اعتبار سے کہ شاعری کی تخلیق میں کثافت یا مادے کا عنصر کم سے کم ہوتا ہے، صرف حرف وصوت تو کثافت سے تعبیر کر سکتے ہیں کہ شاعری انہی کے پیرائے میں جنم لیتی ہے، پھر چونکہ شاعری بذات خود ایک طرح کی حسن کاری وحسن آفرینی بھی ہے اور حسن اپنے اظہار کیلئے کسی نہ کسی مادہ یا مقرون شے کا محتاج ہے اس لئے شاعری کو بھی کثافت کا سہارا بہر حال لینا پڑتا ہے۔ غالب نے سچ کہا ہے کہ

''لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی''۔

لطافتِ کلام کی انتہا یہ ہونی چاہئے کہ اسے ضبط تحریر میں لانا دشوار ہوجائے لیکن اسی جگہ لطافت مجرد زیرِ بحث نہیں شاہدہ حسن کے حوالے سے لطافت شعری زیرِ بحث ہے۔

شاہدہ حسن کے کلام کا مطالعہ بتاتا ہے کہ شاعرہ کا ذہنی اُفق خاصا وسیع ہے اور اس اُفق پر رنگ ونُور کی جو دلربا قوس قزح نظر آرہی ہے وہ مشرق ومغرب دونوں کیلئے مستفیض ہے لیکن بحیثیت مجموعی مشرقیت کا اثر بہت گہرا اور نمایاں ہے۔ اس میں مہاجرت ومسافرت، تنہائی کا خوف اور احتجاج وانحراف کی وہ لہر بھی نظر آتی ہے جو اس وقت کے سارے باشعور شاعروں کے ہاں موجود ہے۔ اس اعتبار سے شاہدہ حسن کی شاعری۔ عصری شاعری کے عمومی موسم سے ہم آہنگ بھی اور اس کے اثرات سے الگ بھی اور یہی اس کی انفرادیت ہے۔

ویسے بحیثیت مجموعی شاہدہ حسن بنیادی طور پر حرارت وحرکت اور روشنی کی شاعرہ ہیں۔حرارت نام ہے شاہدہ حسن کے ذہن کی اس کی سوچ کا جوایک خاص مدت تک کھلے ماحول میں سانس لینے سے پیدا ہوتی ہے۔اس حرارت وروشنی کا عکس، مندرجہ ذیل اشعار میں واضح طور پر نمایاں ہے۔

اُڑائے پھرتی ہے دل کو ہوائے بے خبری
سو ان رُتوں میں کسے حوصلہ خبر کا ہے

تھے جس کی کہانیوں کے چرچے
کیا جانے وہ عشق اب کہاں ہے

جب خوشی سے آئی تھی، خود ہوا دریچے تک
دل کو چھو رہا ہے پھر، ایک غم کا جھونکا کیوں؟

اِک ساتھ کُھلیں جو پَر ہوا میں
پرواز کا لطف ہی جُدا ہے

ہوا کے رُخ پہ کُھلے تھے جو بادباں، گم ہیں
اسی زمین میں کئی میرے آسماں گم ہیں

یہ غزل کے اشعار ہیں، شاہدہ حسن کی نظموں خصوصاً مختصر نظموں میں بھی غزلیت کا یہی رنگ ونُور، جاری وساری ہے کم از کم ذیل کی نظمیں ثابت کرتی ہیں

زندگی کرنے کا ہنر

ہوا سے کب گھبرائی؟
پھر میں دل روشن رکھنے کو
ایک دیا لے آئی

شعر کیا چاہتا ہے
نہیں
یہ نہیں چاہتا، کربِ تخلیقِ فن
میں کسی کہنہ، بوسیدہ جذبے کو
خوش رنگ لفظوں میں ملفوف کر دوں
سجا دوں
تو اِک خوبصورت، سجل نظم ہو جائے گی
شعر کہنا ہے مجھ سے
کہ میں گردشِ خون کی تال پر
دیر تک رقص کرتی رہوں
اپنے زخموں کی ڈھانپوں نہیں
تیز، وحشی ہواؤں کے رُخ پر۔۔۔ کھلا چھوڑ دوں

صادقہ فاطمی، دھڑکن کی شاعرہ

موضوع و مواد اور افکار و خیالات کے اعتبار سے ہمارے شعراء متعدد خانوں میں بٹے ہوئے ہیں، کوئی عشق مجازی کا شاعر ہے، کوئی عشق حقیقی کا، کوئی عوام کا شاعر ہے، کوئی خواص کا، کوئی ردِ تشکیل کا شاعر ہے، کوئی تشکیل کا، کوئی ساختیات کے نظریئے سے وابستہ ہے اور کوئی پس ساختیات کے زاویئے سے، کوئی جدیدیت کا شاعر ہے اور کوئی جدید حسیت کا۔ مختصر یہ ہے کہ آج کل کے بیشتر شعراء کسی نہ کسی نظریئے سے وابستگی کے ساتھ اپنی انفرادیت کا اظہار وادّعا کرتے ہیں، انسانی محسوسات و جذبات کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی حالانکہ سچی و حقیقی شاعری، جذبے اور احساس کی کوکھ ہی سے جنم لیتی ہے۔ تخلیق شعر کے اس پس منظر میں صادقہ فاطمی کا "دھڑکن" کی شاعرہ کی حیثیت سے سامنے آنا ایک طرح کی جرأت بھی ہے اور توفیقِ الٰہی بھی۔

"دھڑکن" کے بارے میں سوال کیا جاسکتا ہے کہ کس کی دھڑکن؟ اور کیسی دھڑکن؟ جواب یہ ہے کہ دل کی دھڑکن، جس کے بارے میں خواجہ میر درد نے کہا ہے

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبادت ہے تیرے جینے سے

وہی دل جس کے بارے میں جگر مرادآبادی نے حکم لگایا ہے کہ

کامل، رہبر، قاتل رہزن
دل سا دوست نہ دل سا دشمن

وہی دل جس کے لئے کہا گیا ہے کہ

دل مردہ دل نہیں اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمتوں کے مرض کہن چارہ

اب رہ گئی ''دھڑکن'' سو، اس کے بارے میں سب ہی جانتے ہیں۔ اسی دھڑکن کا دوسرا نام محبت یا دردِ محبت ہے۔ محبت کے بارے میں فانی بدایونی نے کیسی خوبصورت بات کہی ہے کہ

بہت نازک مگر جب توڑے تو ٹوٹنا مشکل
یہ زنجیر محبت بھی عجب زنجیر ہوتی ہے

اور دردِ محبت کی دولت کے سلسلے میں یہ اشعار بھی فانی بدایونی ہی کے ہیں

درد دیا کرم کیا، اب اسے لا دوا بنا
شیشۂ دل عطا کیا، اب اسے پاش پاش کر

وہ درد دے کہ موت بھی جس کی دوا نہ ہو
اُس دل کو موت دے جسے اچھا کرے کوئی

صادقہ فاطمی کے یہاں بھی اسی محبت اور دردِ محبت کا نام دھڑکن ہے اس ''دھڑکن'' کی کیفیت و نوعیت کیا ہے اور جس دل میں یہ دھڑکن بسیرا کر لیتی ہے اس کا کیا عالم ہوتا ہے، اس کا حال خود صادقہ کی زبان سے سُن لیجئے زیادہ دلپذیر محسوس ہوگا

الم کا نشان ہے دھڑکتا ہوا دل
بڑا مہرباں ہے دھڑکتا ہوا دل
محبت، عدالت، شجاعت، صداقت
اِنھیں کا بیاں ہے دھڑکتا ہوا دل

مچلتے ہیں جس میں محبت کے چشمے
وہ کوہِ گراں ہے دھڑکتا ہوا دل
اُسے ضُعفِ پیری کا دھڑکا نہیں ہے
جو یاں ہی جواں ہے دھڑکتا ہوا دل
یہاں فصلِ گُل لہلہاتی رہے گی
عجب گلستاں ہے دھڑکتا ہوا دل

ان اشعار کی روشنی میں سوال کیا جاسکتا ہے کہ آخر دل دھڑکتا کیوں ہے؟ مختصر سا جواب یہ ہے کہ یہ اقتضائے بشریت ہے، انسان کی مجبوری ہے، فطرتِ انسانی کچھ اس نوع کی ہے کہ اس کا دل بنی نوع انسان کے دکھ درد پر تڑپ اُٹھتا ہے غالب نے یوں ہی نہیں کہا تھا کہ

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رولائے کیوں

دل کے اس جبلّی میدان میلان کو صادقہ فاطمی نے اپنے حسّی تجربوں کی روشنی میں قدرے وضاحت سے یوں بیان کیا ہے کہ

کیسا حسن ہے ہر سو
دامنِ بہاراں میں
یہ رچی ہوئی خوشبو
روح میں سماتی ہے
کائنات کی ہر شے
کیسی جگمگاتی ہے

کیا یہ سارے منظر ہیں
خاک میں سمانے کو
دل تو ایک ساغر ہے
دیکھ کر غمِ دنیا
دل تو بھر ہی آئے گا
لاکھ ہم اسے روکیں
یہ چھلک ہی جائے گا

صادقہ فاطمی نے غزل اور نظم دونوں کو اس دھڑکن کا وسیلۂ اظہار بنایا ہے، لیکن پیرایۂ بیان ہر جگہ غزل کا رکھا ہے۔ غزل خود کیا ہے؟ صادقہ نے اس کے جواب میں نہایت خوبصورت اور فکر انگیز بات کہی ہے کہ

خود بھی چاکِ گریباں ٹھہرا، ہم کو بھی برباد کیا
کیسا قاتل شخص تھا جس نے حرفِ غزل ایجاد کیا

یہ شعر اُردو فارسی کی ساری غزلیہ روایت کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے، صادقہ نے اس شعر کو نقل کر کے اس کے اُوپر ''غزل غزالاں'' کا عنوان قائم کیا ہے۔ یہاں غزل غزالاں کی ترکیب نہایت حسن کارانہ تاریخی واقفیت رکھتی ہے اور غزل کے سوز و گداز کی طرف واضح اشارہ کرتے ہوئے صادقہ کی وسعت مطالعہ پر دلالت کرتی ہے۔ یہ بات اس لئے کہی جا رہی ہے کہ معتبر علمائے ادب نے غزل کی تعریف اور اس کے لغوی و اصلاحی مفہوم کے سلسلے میں طویل بحث کرتے ہوئے اس کے معنی کے متعدد رُخ متعین کئے ہیں ان میں

ایک رُخ ''غزال'' سے وابستگی کا ہے اور غزل کے مزاجِ خاص سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔

ماہرینِ فن اور اساتذۂ فنِ سخن کا کہنا ہے کہ کتا جب ہرن یا غزال کا شکار کرتا ہے تو غزال حد درجہ مایوسی اور مجبوری کے عالم میں ایسی پرسوز آواز نکالتا ہے کہ کتا ترس کھا کر غزال کو چھوڑ دیتا ہے، اسی آواز کا نام ''غزل'' ہے، اور غزلیہ شاعری کے اسی سوز وگداز کی رعایت سے صنفِ غزل کو غزل کہا جاتا ہے۔ صادقہ نے غزل کے اس وصفِ خاص کو اپنی غزلوں میں ملحوظ رکھا ہے۔ صرف ایک مختصر سی غزل دیکھئے مرے بیان کی تصدیق ہو جائے گی

یہ عکس ہے لہو کا لبوں پر ہنسی نہ دیکھ
ہے ریزہ ریزہ دل یہ کسی کو خبر نہیں
ویراں اگر ہم چشم تو بہتے نہیں ہیں اشک
داماں ہے تار تار مگر تربتر نہیں
کب سے بھٹک رہا ہے اندھیروں میں قافلہ
سب ہمسفر ہیں کوئی یہاں راہبر نہیں

بایں ہمہ میرا خیال یہ ہے کہ صادقہ کی فنکاری اور فکر ونظر کی جولانی کے اصل جوہر، غزل میں نہیں نظم میں کُھلتے ہیں۔ نظموں کی تعداد بھی غزلوں کے مقابلے میں زیادہ ہے اور موضوع کے لحاظ سے تو یہ نظمیں ایسی ہیں کہ ان پر اظہارِ خیال کے لئے خاصا وقت درکار ہے اور سر دست یہ مجھے میسر نہیں، مختصراً اتنا ضرور عرض کروں گا کہ اُن کی ساری نظموں میں اُن کے دل کی دھڑکنیں ایسی رچی بسی ہیں جیسے انسانی رگوں میں خون۔ ان دھڑکنوں کو کان لگا کر سنئے تو اندازہ ہوگا کہ صادقہ فاطمی کی دھڑکنوں کا تعلق ان سارے واقعات وحادثات اور واردات ومقامات سے ہے جہاں آدمی وآدمیت اور انسان اور انسانیت کو مجروح ومضروب کیا

جاتا ہے۔ وہ بنی نوع انسان کے ہر دکھ درد میں شریک رہنے اور حتیٰ الامکان اُس کی اعانت کرنے پر اطمینان وفخر محسوس کرتی ہیں اور رنگ و نسل، مذہب وعقیدہ نیز علاقہ وطبقہ کی سطح سے بلند ہو کر ایسا کرتی ہیں امیرؔ مینائی کا شعر اُن کے کردار و عمل اور فکر و نظر پر صادق آتا ہے کہ

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

آخر میں اس بات کو پھر دہرانا ہے کہ صادقہ فاطمی صرف شاعرہ نہیں بلکہ نہایت مہذب وشائستہ ذہن کی مالک باشعور و باخبر اور وسیع المطالعہ شاعرہ ہیں۔ انہوں نے اپنے مجموعہ کلام میں جا بجا میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، فیضؔ اور مجروح سلطان پوری کے اشعار کا جیسا خوبصورت اور برمحل مصرف کیا ہے وہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کیلئے توفیقِ الٰہی درکار ہوتی ہے اور الحمدللہ صادقہ فاطمی کو یہ توفیق میسر ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں مزید توفیقات سے نوازے۔

صالحہ کوثر اور تسنیم کی شاعری

یہ روایت عام ہے کہ کوثر و تسنیم جنت کی دو پاکیزہ نہریں ہیں لیکن میرے سامنے اس وقت صالحہ کوثر اور سراج المنیر تسنیم نام کی شاعرات کے دو شعری مجموعے ہیں۔

''سرو و چنار کا موسم'' صالحہ کوثر کا مجموعۂ غزلیات ہے اور ''محبت خوشبو ہے'' سراج المنیر تسنیم کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔

صالحہ کوثر کس مزاج کی شاعرہ ہیں اس کا اندازہ مندرجہ ذیل دو شعروں سے کیا جا سکتا ہے

چلنا چاہو تو ارادہ ہی بہت ہوتا ہے
کوئی زنجیر نہیں راہ میں دیوار نہیں

ایک رستہ تو ہمیشہ ہی کھلا رہتا ہے
وار کوشش کا تو جاتا کبھی بیکار نہیں

ان کا پورا مجموعۂ کلام اسی رنگ و آہنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ غزلوں کی بحریں چھوٹی چھوٹی ہیں لیکن معنی خیز ہیں اور کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات کہہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی غزل کے چند اشعار دیکھئے

عمر کی مسافت میں آبلے سلامت ہیں
زندگی کے رستوں میں حوصلے سلامت ہیں

پھول سے کبھی خوشبو دور رہ نہیں سکتی
جب تلک محبت کے سلسلے سلامت ہیں

ظلمتوں کے موسم میں روشنی نہیں ہوتی
رات کے اندھیروں میں رت جگے سلامت ہیں

جو بھی آیا دنیا میں لوٹ کر گیا واپس
اور آنے جانے کے سلسلے سلامت ہیں

ان کے مجموعہ کلام کے آغاز میں احمد ہمدانی، مظفر احمد ضیاء اور شان الحق حقی کی آرا درج ہیں اور یہ ظاہر کرتی ہیں کے ان کے کلام سے چھوٹے بڑے حلقے روشناس ہیں۔

سراج المنیر تسنیم صالحہ کوثر کی چھوٹی بہن ہیں لیکن اپنے قد و قامت اور شعری مزاج کے اعتبار سے ایک جیسی ہیں۔ ایسا ہونا غیر فطری نہیں اس لئے کہ کوثر و تسنیم ایک ہی ماحول کی پروردہ ہیں۔ ان کے والدین اعلیٰ تعلیم یافتہ اور شائستہ مزاج تھے۔ انہوں نے بچیوں کی تعلیم و تربیت پر پوری توجہ صرف کی نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں قابلِ ذکر شاعر کی حیثیت سے سامنے آئیں اور اُردو شاعری کی تاریخ میں اپنے نام و کام کے ساتھ اپنے خاندان کا نام بھی روشن کیا۔ ان کی غزلوں پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوا کہ وہ بھی اپنی بڑی بہن صالحہ کوثر کی طرح چھوٹی بحروں میں شعر کہتی ہیں۔ ان کے مجموعے کے آغاز میں جو غزل ملتی ہے اس کا مطلع ہے

محبت چاند دنیا چاندنی ہے
اسی کی میرے دل میں روشنی ہے

اس غزل کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ان کی غزلیہ شاعری حُسن و عشق کی پاکیزہ اور فکر انگیز روایات کی پروردہ ہے۔ ان کے شعری مجموعے میں غزلوں کے ساتھ ساتھ جا بجا

قطعات بھی ملتے ہیں ایک قطعہ دیکھئے۔

کون ہے جو آشنائے غم نہیں
کونسی ہے آنکھ جو پُرنم نہیں
آج کل جو شہر کے حالات ہیں
کل نہ جانے ہوں گے بھی ہم یا نہیں

اس قطعے کی روشنی میں ان کی فکر ونظر کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔

صبیحہ صباء، جذبہ وفکر کے امتزاج کی شاعرہ

ڈاکٹر صبیحہ صبا کی شاعری معنی کی سطح پر افکار و جذبات کے خوبصورت اتصال و امتزاج کی شاعری ہے اور لفظ کی سطح پر بہترین الفاظ میں بہترین اظہار کی شاعری ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ وہ محض شاعرہ نہیں بلکہ ایک عالم اور اسکالر بھی ہیں۔ کیمیا کی استاد ہیں، سند فضیلت رکھتی ہیں یعنی پی ایچ ڈی ہیں، تخلیقی ذہن رکھنے کے ساتھ ساتھ جدید علم وفکر کی قیمتی شال بھی اوڑھے ہوئے ہیں لیکن جس طرح وہ محض شاعرہ نہیں ہیں اسی طرح محض علم کیمیا کی ماہر یا کیمیا گر بھی نہیں ہے بلکہ ایک صاحبِ دل خانوادے سے رشتہ رکھنے کے سبب انہیں خواجہ میر درد کی یہ بات بھی ذہن نشین ہے کہ

ہے کیمیا سے بہتر دل کو گداز کرنا
اکسیر پر موّس اتنا نہ ناز کرنا

اگر دل کو گداز کرنے ہی کی بات ہوتی تو بھی کوئی بات نہ تھی مشکل یہ ہے کہ گدازیٔ دل کے ساتھ وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ جسے زندگی کہتے ہیں اس کا تعلق جسم سے نہیں دل سے ہے اس لئے انہیں خواجہ میر درد کی طرح یہ ڈر بھی رہتا ہے

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

ایسی صورت میں میں نے جو یہ کہا ہے کہ صبیحہ صبا کی شاعری علم وفکر کے خوبصورت اظہار اور لفظ کی سطح پر جمال افروز اظہار کی شاعری ہے تو وہ کچھ غلط نہیں کہا، اُن کے یہاں علم وفکر اس طرح جذب ہو گئے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا

مشکل ہے، ان کی شاعری محض ہلکے پھلکے یا زود فنا جذبوں کی شاعری نہیں ہے۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر جذبے معمولی درجے کے بھی ہوں لیکن انہیں تخلیقی زبان میسر آجائے تو ان میں شاعری کے بہت کامیاب آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن اچھے شاعر اور اچھے شعر کی پہچان یہ ہے کہ شعر سن کر پہلے شعر کے تخلیقی حُسن یعنی شعریت اور تغزل کا احساس ہو پھر جب سننے والا شعر کی کیفیت سے لذت یابی کے بعد ذہن کی میزان پر شعر کو تولے تو شعری حُسن کے ساتھ ساتھ شاعر کی فکری سطح بھی روشن تر ہوتی جائے۔

صبیحہ صبا کی شاعری علم و فکر اور جذبات کے دیرپا اور خوبصورت امتزاج کی شاعری ہے اس میں نہ تو علم و فکر کا پُر شور غلبہ ہے اور نہ جذبات کا وہ اُبال جسے ہانڈی کا اُبال کہتے ہیں بلکہ فکر و جذبے کے عناصر ایک دوسرے کی انگلی پکڑ کر نہایت شائستگی و خاموشی سے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ یہ شائستگی و خاموشی شاعری کا کمال کہلاتی ہے۔

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے
نگاہ دل سے تری سرمہ سا نکلتی ہے

صبا نے نہ جانے کس عالم میں یہ دعا مانگی

مجھے گفتگو کا ہنر نہیں مری خاموشی کو کمال دے
مرے فن کا رُخ ہے دھواں دھواں اسے فکر کے خد و خال دے

یہ دعا قبول ہوئی اور ان کی شاعری جسے میں عشقیہ شاعری کہوں گا ان کے جذبوں اور ان کے علم و فکر کی خوبصورت ترجمان بن گئی۔

ہر لفظ فکر و خیال کا ترجمان ہوتا ہے، لفظ کے ذریعے شاعر ہم کلام ہوتا ہے اور لفظ ہی کی مدد سے آپ لطف اندوز ہوتے ہیں، گویا لفظ محض حرف و صوت کا نام نہیں بلکہ ہر لفظ اپنے

معنی و مفہوم بھی رکھتا ہے۔ حتیٰ کے مہمل الفاظ بھی معنی رکھتے ہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ مہمل کو مہمل نہ کہتے، لفظ و معنی نام کے اعتبار سے الگ الگ سہی باطن میں ایک ہیں۔ یہی اکائی جب جب شعر کی صورت میں برجستہ در آتی ہے تو شاعری کو جزو است از پیغمبری کے منصب پر فائز کرتی ہے اور شاعر کے اندازِ تکلم کو منفرد بنا دیتی ہے۔ نیا ڈکشن دے دیتی ہے لفظوں کو شاعر کی ندرتِ فکر کا واضح نشان بنا دیتی ہے۔ اس واضح نشان کیلئے مثلاً صبیحہ صبا کی یہ دعا ہے۔

میں خیال کہنہ کے پیرہن کوئی تراش خراش دوں
نعتِ جدید کے ذیل میں کوئی دے تو میری مثال دے

صبیحہ کی یہ دعا بھی قبول ہوئی تب ہی تو انہوں نے اتنے عمدہ اشعار کہے

اب کے ممتاز محل، تاج محل، شاہجہاں
ہوگئے قصہ پارینہ کے عنواں جاناں
کیوں نہ تعمیر کریں درد کا وہ قصرِ سخن
جس میں ہم تم رہیں ایک ساتھ غزل خواں جاناں

کیا ہوا رات کے آنچل پہ ستارے جو نہیں
میری پلکوں پہ تو رہتا ہے چراغاں جاناں
تمام گفتگو میں تذکرہ تو دوسروں کا تھا
یونہی رَوا رَوی میں میرا حال پوچھتے رہے
گناہگار سہی پھر بھی میرے حصے کا

تری طرف جو نکلتا ہے وہ ثواب تو دے
بھری بہار رتوں میں بھی خارے آئی
یہ انتظار کی ٹہنی کبھی گلاب تو دے

جھلملا اُٹھتی ہیں اکثر، اس کی یادوں کی طرح
چوڑیاں جو ہاتھ میں ہیں اس کی پہنائی ہوئی

اک حسرتِ تعمیر جو اس دل میں نہاں ہے
بنوائے گی اس وادیٔ غربت میں مکاں اور

اے نکہتِ گل کیوں اس ہمراز بنایا
یہ بادِ صبا راز کو کرتی ہے عیاں اور

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار، تمنا کہیں جسے

تمنا کیا ہے اس کا دوسرا نام شوق و آرزو، خواہش، حسرت، اشتیاق ہے اور یہ سب عشق و محبت ہی کی دوسرے نام ہیں اور عشق و محبت کا معاملہ دل کا معاملہ ہے، دل کے معاملات کنایات و اشارات ہی میں بتائے جا سکتے ہیں۔ گویا صبیحہ صبا جن کی شاعری اساسی طور پر عشقیہ شاعری کے ذیل میں آتی ہے اظہارِ تمنا کیلئے استعارات و کنایات ہی سے کام لیا ہے۔ عشق کا موضوع اگر چہ زندگی کا قدیم ترین موضوع ہے اور شاید اسی لئے بعض اسے فرسود کہنے لگے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ یہ کار بار دلداری کا ہے اور اس کے ہزاروں پہلو ایسے ہیں جو ہنوز

نامحسوس ہیں۔ محسوس کیے ہوئے پہلو بھی عجیب جادو رکھتے ہیں۔ تب ہی تو صبیحہ نے کہا۔

مرے ناراض شانوں کو تھپک کر بارہا کہنا
چلو چھوڑو، گلے شکوے، کبھی مانو مرا کہنا
جو مرا برسبیلِ گفتگو ، کچھ ذکر آ نکلے
بجائے نام لینے کے، مجھے موجِ ہوا کہنا

زندگی مسلسل آرزو مندی کا شوق بے پایاں ہے، سراپا طلب بن جانے کا اور اضطراب مسلسل کا تمنا میں زندگی کا حاصل ہے، جو کسی طرح کی تمنا نہیں رکھتے وہ مردہ ہیں، صاحبانِ دل، آرزو کے پروردہ ہیں۔ زخمِ تمنا اُن کے لئے آفت نہیں رحمت و نعمت ہے، وہ نہیں چاہتے کہ یہ زخم کبھی مندمل ہو جائے یا اس پر کھرنڈ جم جائے وہ اسے ہمیشہ ہرا اور تازہ رکھنا چاہتے ہیں۔

دیکھو کہیں اس زخم پر انگور نہ آجائے
یہ زخمِ تمنا ہے اسے ناز سے پالو
جو تندیٔ صہبائے کہن سے بھی نہ پگھلے
اے کوزہ گرو! ایسا کوئی جام تو ڈھالو

یہ ایک افسوں انتظار ہے جو زندگی بھر اپنے طلسم میں گرفتار رکھتا ہے، اس کی نہ کوئی منزل ہے نہ اس کا کوئی مقام مسلسل اضطراب ہی اس کا مدعا اور اس کا حاصل ہے، اس کی حدود و مسافت محدود نہیں لامحدود ہے۔

ٹھیک ہے ختم ہوئیں شہر کی تمنا کی حدود
پائے وحشت ترے آگے، ہیں مضافات بہت

بُھلا تو دیں یہ داستاں پُرانی مگر ہم اس دل کو جانتے ہیں
ادھر یہ قصہ تمام ہوگا اُدھر نئی واردات ہوگی

صبیحہ صبا کے مندرجہ بالا اشعار کی روشنی میں کہنا پڑتا ہے کہ صبیحہ صبا کی شاعری کے بارے میں احمد ندیم قاسمی صاحب کا یہ قول محض سچ نہیں بلکہ سو فیصد سچ ہے۔

''صبیحہ صبا کی غزل اُردو شاعری کی تمام و کمال مثبت روایات کا حیرت انگیز اور دل آویز نچوڑ ہوتی ہیں، یوں معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے ولی سے اب تک کی اُردو غزل کا اتنا گہرا مطالعہ کیا ہے کہ اُن کی غزل پڑھیے تو اس پر کلاسیکیت کا دھوکا ہوتا ہے۔ دورِ حاضر میں قدیم و جدید کا اتنا متوازن اور بھرپور امتزاج صبیحہ صبا کے سوا شاید ہی اُن کی عمر کے کسی دوسرے شاعر میں موجود ہو۔ ان کی غزل پڑھنے کا لطیف تجربے کے علاوہ اگر آپ کو ان کی غزل خود اُن کی زبانی سُننے کا حُسنِ اتفاق ہوا ہو تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غزل کہیں اُوپر سے اُتر رہی ہے اور فضا میں حلول کر رہی ہے اور ماحول میں گھُل رہی ہے۔ پھر وہ وطن سے ہزاروں میل دور، نیویارک کے بھاگتے دوڑے اور ہانپتے حول میں برسوں سے مقیم ہیں مگر اُنہوں نے جذبہ واحساس وفکر وخیال میں اجنبیت کو داخل نہیں ہونے دیا۔ ان کے لہجے میں وہی محبت بھری اپنائیت ہے جیسے وہ کراچی یا لاہور یا اسلام آباد میں مقیم ہیں''۔

عرفانہ عزیز کی شاعری

عرفانہ عزیز کا پہلا شعری مجموعہ ''برگ ریز'' کوئی بیس بائیس سال پہلے مری نظر سے گزرا تھا اور اپنے اسلوب کا ایک خاص نقش میرے ذہن پر چھوڑ گیا تھا۔ پھر ان کا دوسرا مجموعہ ''کفِ بہاراں'' دیکھنے کو ملا۔ اس نے نقشِ اول کو مزید گہرا اور روشن کر دیا۔ وجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری شروع ہی سے اپنے معاصر شعراء و شاعرات سے بہت مختلف ہے۔ سوچ کے اعتبار سے بھی اور لفظی پیکر کے اعتبار سے بھی۔

عرفانہ عزیز کی سوچ میں نیا پن اور تازگی تو ہے لیکن سوچ کی وہ غلط روی نہیں جو ہمارے شعراء میں حدت و جدیدت کے نام سے بالعموم پیدا ہوگئی ہے۔ رہ گئی لفظی پیکر تراشی سو وہ تو سرتا سر اُس دلکش فارسی رنگ و روپ میں ڈھلی ہوئی ہے جس سے اُردو کی بہترین شاعری عبارت ہے۔ خواہ یہ شاعری غالب و اقبال کی ہو یا فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کی۔ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ عرفانہ عزیز کی شاعری تمام تر انفرادیت کے باوصف اپنی زمین اپنی ثقافت اور اپنی اقدار اپنی شعری روایات اور اپنے اسالیب حیات سے پوری طرح جڑی ہوئی ہے۔ چند اشعار دیکھئے

موجِ شبِ فراق ہے گرداب کی طرح
دل خوں ہوا ہے دیدۂ پُرآب کی طرح

دیوارِ دل پہ سایہ فگن ہے قبائے گل
اِن ریشمی فضاؤں میں مہتاب کی طرح

آنکھوں پہ رکھ دیئے ہیں قدم کس کی یاد نے
میرے لہو میں چاند رچا خواب کی طرح

دیتی تھی زندگی کی دُعائیں جسے نظر
اُترا مرے لہو میں وہ زہراب کی طرح

عرفانہ عزیز کا شعری ڈکشن کچھ اس طرح کا ہے کہ اُسے نظم اور غزل کے خانوں میں تقسیم کر کے دیکھنا دکھانا مشکل ہے۔ ان کی ہر غزل میں نظم کا اور ہر نظم میں غزل کا ذائقہ ہے اور یہ دونوں ذائقے باہم مل کر ایک ایسے ذائقے کو جنم دیتے ہیں جسے صرف عرفانہ عزیز کی شاعری سے مختص کر سکتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتی ہیں

ڈھل چکی شام مگر گھر کے دریچوں سے اُدھر
برف زاروں میں سُلگتے ہوئے آتے ہیں نظر
بھورے پرندے اب تک
جن کی پہچان شبِ غم ہے نہ نورِ خورشید
جن کی پرواز کسی سمت سے مانوس نہیں
بال و پر جن کے ہیں دکھ کی تمہید
نیم روشن سی فضاؤں کے دھندلکوں میں نہاں
سنگ بستہ ہے رمِ آب جہاں
نیلی لہروں سی تہی
زندگی رہنے کا وسیلہ ہیں ابھی
چند شفاف نقوش

عرفانہ عزیز چھوٹی بحروں میں اور چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں اپنی بات بہت

عمدگی سے کہتی ہیں۔ اس جگہ میں اُن کے چند اشعار نقل کر رہا ہوں

اُسے تو مجھ سے بچھڑ کر بھی مل گئی منزل
میں فاصلوں کی طرح کھو گئی خلاؤں میں

سکوتِ لب جو نہ ٹوٹا تو سوئے دشتِ وفا
ہمیں بھی پاؤ گے زنجیر کی صداؤں میں

ہلاکِ زندگی ہر چند ہوں میں
دوامِ زیست میرا مدعا ہے

زمانہ آ گیا فرقت کا شاید
تری آنکھوں میں وحشت کی فضا ہے

چاندنی رواں جیسے درد کی فصیلوں پر
آج چشمِ پرنم میں شہرِ آب سا دیکھوں

یہ تمام چھوٹی بحروں میں کہے گئے اشعار اپنے اندر ایک طویل داستان رکھتے ہیں۔ اور غور کیجئے تو ان کے سر پر نظموں کا سایہ منڈلاتا ہوا نظر آئے گا۔ ہر چند کے عرفانہ عزیز کی نظمیں طولانی ہیں لیکن ساری کی ساری نظمیں چھوٹے مصرعوں میں ہیں گویا نظم اور غزل دونوں میں عرفانہ عزیز کا ڈکشن ایک جیسا ہے اور وہ یہ ہے کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ بات کہنے کا فن جانتی ہیں۔ اور یہ بھی وصف ان کے ہاں بہت نمایاں ہے کہ وہ لمبی نظموں کو چند لفظوں میں اس طرح سمیٹ لیتی ہیں کہ ان کی نظم کو غزل سے اور غزل کو نظم سے الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

یہ ان کی شاعری کا ایسا کمالِ فن ہے جو ان کی ہم عصر شاعرات میں کم ہی نظر آتا ہے۔

مجھے فیض صاحب کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ

''ان کے غنائیہ کلام کی سادگی اور گداز بے سلیقہ خودنمائی اور مصنوعی بند باتیت سے ملوث نہیں اور ان کا خطیبانہ اور ''تبلیغی'' نظموں کا خلوص اور وقار تعلّی اور بے جا غلو سے پاک ہے۔ ان کی زبان اور لہجہ خالص کلاسیکی ہونے کے باوجود محض روایات کی سطح سے ہمیشہ بلند تر رہتا ہے اور ان کے ترنم کا زیر و بم بہت تنوع کے باوجود کبھی غیر مترنم نہیں ہوتا''۔

غزالہ خاکوانی کی شاعری

غزالہ خاکوانی کا شعری مجموعہ ''میرے پر نہ باندھو'' اس وقت میرے پیشِ نظر ہے اور مجھے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ ان کی شاعری نسوانی احساسات اور جذبات و کیفیات سے عبارت ہے۔ انہوں نے اپنے اشعار میں جذبات کا اظہار شدت کے ساتھ جاندار انداز میں کیا ہے۔ غزالہ خاکوانی کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت احساس کی تازگی ہے ان کی غزلیں اور نظمیں دونوں ہی اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ ان میں شاعرہ کے دل کی دھڑکن واضح طور پر سنی جاسکتی ہے۔ ان کا خوبصورت لب ولہجہ اور جاندار اسلوب انہیں ہمعصر شاعرات سے الگ کرتا ہے چند اشعار دیکھئے

یارب سیاہ رات کو اب تو سویر دے
ورنہ ہمارے خوابوں کے شیشے بکھیر دے

غمِ حیات، غمِ عاشقی، غمِ دنیا
ہر ایک غم کو غزل میں سمو رہی ہوں میں

اس آرزو میں زندگی ساری گزر گئی
ملنا ہے ایک دن مجھے اپنے حبیب سے

غزالہ خاکوانی، زندگی کے تلخ و شیریں تجربات کو بیان کرنے اور الفاظ کے ذریعے تصویریں بنانے کا فن جانتی ہیں غزالہ نے گاہے گاہے گردشِ زمانہ کی شکایت بھی کی ہے لیکن ہمت اور حوصلے کے ساتھ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری غمِ حیات کی عکاس بھی ہے اور غمِ

عشق کی بھی، فنی اعتبار سے یہ سادہ بھی ہے اور پُرکار بھی۔ دل آویز بھی ہے اور نظر گیر بھی۔ ایک مختصر نظم دیکھئے جو غزالہ خاکوانی کی شاعرانہ صلاحیتوں پر دلالت کرتی ہے۔

جب سارا منظر دیکھ چکے
تو خوابوں میں کھو جانا کیا
میرے من کا پنچھی پاگل ہے
جواب بھی رستہ دیکھتا ہے
مرے دل کا بچہ ____ ضدی بچہ
آس لگائے جیتا ہے
اس من کو میں سمجھاؤں کیا
جو رستہ تیرا رستہ نہیں
اب اس رستے پر جانا کیا
جو منزل، منزل تیری نہیں
اب اس کا کھوج لگانا کیا
لیکن میرے دل کا بچہ ____ ضدی بچہ
جب صورتحال سمجھتا نہیں
اسے رہ رہ کر سمجھانا کیا

غزالہ خاکوانی کی شاعری محسوسات و جذبات کی رنگا رنگی کے باوصف ہر قسم کی ہرزگوئی ناہمواری، عدم شائستگی اور بے کیف ترکیب سازی سے پاک ہے جو کچھ ہے صاف وشفاف اور عام فہم زبان میں کہا ہے۔

فاطمہ قیصری ریحانہ کی متصوفانہ شاعری

منفرد اسلوب کی صاحب دل شاعرہ قصبہ کوٹ تحصیل کھاگا ضلع فتح پور سے ان کا آبائی تعلق ہے۔ لیکن ان کی ساری تعلیم وتربیت بھوپال میں ہوئی وہاں ایک مدت سے ان کا خاندان بسلسلہ کسب معاش آباد تھا۔ فاطمہ قیصری ریحانہ کا مجموعہ شاعری ''تحفہ دل'' اس وقت میرے سامنے ہے ۳۲۰ صفحات کا خوبصورت مجموعہ نہایت عمدہ کتابت میں علوی برقی پریس بھوپال سے نومبر ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ ''تحفہ دل'' کا جو نسخہ میرے سامنے ہے وہ عزیز برکت علی خان کوٹی کی مملکت ہے۔ ''تحفہ دل'' کا انتساب محمد عبدالقیوم عرف منظور احمد کے نام ہے جو شاعرہ کے پیر ومرشد ہیں۔ فاطمہ قیصری ریحانہ کو اپنے پیر ومرشد سے اتنا گہرا لگاؤ تھا کہ اس کا اندازہ اس دیباچے سے لگایا جاسکتا ہے جو کتاب کے صفحہ ۹ پر درج ہے۔ ''اس کلام کے بارے میں چند سطریں لکھ دوں۔ اس میں ایک مصرعہ بھی سوائے اللہ اور اس کے حبیب ﷺ اور اپنے شیخ طریقت کے کسی کیلئے نہیں لکھا گیا۔ میں نے کبھی کلام کی اشاعت کا تصور بھی نہیں کیا۔ میاں ادام اللہ فیوضھم (میرے پیر طریقت) نے ایک مرتبہ (آخر ۱۹۴۸ء) فرمایا ''لکھا کرو'' اور دسمبر ۴۸ء سے خود بخود زبان پر چند شعر آ گئے۔ جنوری ۴۹ء سے اسی طرح بے اختیاری کی شاعری ہونے لگی جو بلا انتخاب اس مجموعہ میں موجود ہے۔ میں نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ صرف اپنے آقا کو سنانے کیلئے لکھتی تھی۔ کسی سے کیا اصلاح لیتی؟ کوئی شعر حذف نہیں کیا، دل دکھتا تھا، جب گیارہ یا تیرہ شعر ہو جاتے تو غزل ختم کر دیتی۔ یہ سب ۴۹ء سے ۵۱ء تک کا کلام ہے۔ پھر کلام کا رنگ بدل گیا۔ اس لئے شائع نہیں کیا جا رہا۔ میاں ادام اللہ فیوضھم کے حکم کے مطابق لکھا تھا۔ انہیں کی خواہش کے مطابق اشاعت ہو رہی

ہے۔ کلام اسی ترتیب سے طبع ہو رہا ہے جس ترتیب سے لکھا گیا تھا۔

دیباچہ اور کتاب کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ قیصری نے اپنے دل کی آواز ہی کو شعر میں جگہ دی ہے۔ اُسی وقت انہوں نے شعر کہا ہے جب ان پر وجہی طور پر دباؤ رہا ہے۔

قیصری کو اردو اور فارسی پر یکساں عبور ہے بلکہ ان کا فارسی کلام تو بعض مقامات پر اردو سے بھی زیادہ پُر اثر اور دل کش محسوس ہوتا ہے۔ ان کے اوصافِ کلام سے صحیح معنوں میں متعارف ہونے کیلئے ضروری ہے کہ ان کے کلام کا خود مطالعہ کیا جائے اس جگہ ان کے منتخب چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

نہ سازم منزل خود کعبہ و دیر و کلیسارا
نہ ضائع می کنم بر آسانِ غیر سجدہ را

بیاساقی سرت گردم مراجام محبت دہ
بیاتا لشکنم از شیشہ قصر تمنا را

ہمہ دل دردِ او گشتہ زکیف مستی و صہبا
نہ ماندہ است جاباقی بگو غمہائے دنیارا

ہزارہا پردۂ ہاحائل نظر حیران دلم غافل
نمی دانم کہ دیدۂ ام چہ گونہ شانِ یکتارا

تو کیا سمجھ سکے گا اگر تجھ سے کہہ بھی دوں
یکساں ہے غمگسار کہوں یا کہ چپ رہوں

سوچا تھا اب وہ آئیں تو کہدوں گا حالِ دل
جب سامنے وہ آئے تو حیراں ہوں کیا کہوں

حیرت نے مجھ سے چھین لی تابِ نگاہ بھی
جی چاہتا تھا دیکھ کر سجدے میں گر پڑوں

ریحانہ جو نگاہ پڑی بن گئی حجاب
کب تو وصالِ یار میں فرقت کا غم سہوں

فرح خیال کا پہلا شعری مجموعہ

آرٹس کونسل کی ایک تقریب سے اُٹھ کر، گاڑی میں بیٹھ رہا تھا کہ کسی نے، ''نیند نہیں آتی'' کا ایک نسخہ تھما دیا۔ یہ فرح خیال کا پہلا شعری مجموعہ تھا، ڈرائیور نے گاڑی ہجوم سے نکالی تو میں کھل کر بیٹھ گیا اور گھر پہنچنے تک، ایک گھنٹے کے سفر میں پوری کتاب دیکھ لی۔

کتاب کی پشت پر شاعرہ کی تصویر کے نیچے یہ دو شعر نظر آئے

کوئی کام ایسا زندگی میں اپنی کر جاؤں
کہ نظروں میں کسی کی قدر اور پہچان ہو جائے

سمندر میں اُتر جاؤں بدن بھی نم نہ ہو میرا
مجھے اے زندگی یوں ذات کا عرفان ہو جائے

کتاب کھولی تو پہلے ہی صفحے پر اس شعر پر نظر پڑی

یہ روح کا میلا پن، مائل یہ گنہ نظریں
یہ کیسی نمازیں ہیں، یہ کسی طہارت ہے

یقین آیا کہ فرح خیال صرف جذبات کی شاعرہ نہیں بلکہ جذبات کے محرکات کی بھی شاعرہ ہیں یعنی فکر و احساس ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور وہ دونوں کو ایک دوسرے سے آمیز کر کے، نہایت سلیقے سے شعر کے پیکر میں ڈھال دینے کی پوری صلاحیت رکھتی ہیں۔ دوسری خاص بات یہ کہ وہ شعر کی جملہ ہیئتوں پر قادر ہیں اور ہر ہیئت میں شعر کہتی ہیں حتیٰ کہ نثری نظم میں بھی وہ غزلیت و شعریت کی کیفیات پیدا کر دیتی ہیں۔

کتاب کے مختصر دیباچہ نے مجھے یہ باور کرادیا کہ وہ ایک نہایت شائستہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ فرد ہیں۔ ان کی ذہنی، روحانی تربیت، پاکیزہ خیالی کے ماحول میں پروان چڑھی ہوئی ہے اوران کی فکر کو جذبے سے اور جذبے کو فکر سے ہم آہنگ کر لینے کا جو سلیقہ میسر ہے وہ ان کی ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ ان کے گردو پیش کی اثر آفرینوں سے بھی گہرا تعلق رکھتا ہے۔ نتیجتاً فرح خیال کی شاعری محض خیال کے حُسن میں گم ہو کر نہیں رہ گئی بلکہ حُسن کو بھی خیال کا جزو بنادیا ہے اوران کے کلام کی پختگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ یہ کام اس وقت سے کر رہی تھیں جبکہ

''مجنوں، لام الف لکھتا تھا، دیوار دبستاں پر''

معنوی حیثیت سے فرح کے کلام کے جس پہلو نے خاص طور پر متاثر کیا وہ زندگی کے بارے میں ان کا رجائی نقطہ نظر ہے۔ حالات کیسے ہی ناہموار و ناسازگار کیوں نہ ہوں، فرح نہ تو اُن سے خوف زدہ ہوتی ہیں نہ فرار کی راہ تلاش کرتی ہیں بلکہ بڑے عزم وحوصلہ کے ساتھ ان پر قابو پالینے کی کوشش کرتی ہیں۔

فرح کی شاعری کی ایک خاص بات یہ ہے کہ فیض احمد فیض کی طرح ان کی اکثر نظمیں غزل نما ہیں اور غزلیں، اپنے اندر نظم کی سی جامعیت رکھتی ہیں، نظموں میں ''رنگ سجائے رکھنا'' دیکھئے۔

جب کوئی خواب نہ ہو
رنگ نہ بکھرا ہو کوئی
کوئی تنہا بھی نہ ہو
کوئی سنورتا بھی نہ ہو
حادثے ہوتے ہوں اور کوئی ٹھہرتا بھی نہ ہو

دلکشی پر نہ کسی کی ہو نظر
کوئی کھاتا نہ ہو رنگین سرابوں کا فریب
کوئی نغمہ کوئی گاتا نہ ہو، ہنستا بھی نہ ہو
اور گریزاں بھی نہ ہو، وحشتِ تنہائی سے
اور مہکتا نہ ہو یادوں کے تصور سے کوئی
آسماں پر کوئی اک تارہ چمکتا بھی نہ ہو
دھڑکنوں میں کوئی آہٹ بھی نہ ہو
ایسے حالات سے تم خود کو بچائے رکھنا
اپنی آنکھوں میں کوئی خواب چھپائے رکھنا
کم بھی ہوں رنگ مگر ان کو سجائے رکھنا
اک تبسم کی فضا لب پہ بنائے رکھنا
دل کو
خالی کبھی ہو جانے کا احساس نہ ہونے دینا۔

غزلوں میں آخری صفحات کی دو غزلیں دیکھ لیجئے

زندگی گزری ہے یوں کوئی سزا ہو جیسے
موت اب لگتا ہے ایسا کہ دعا ہو جیسے

ہے مری ذات میں کیوں جانیے اس درجہ سکوت
یہ خموشی کسی طوفاں کی ادا ہو جیسے

کتنی مدت سے نہیں آیا مجھے اس کا خیال
وہ بھی لگتا ہے مجھے بھول گیا ہو جیسے

خواب دیکھا تو بنی خواب کی تعبیر عذاب
ہے تعاقب میں مرے کوئی بلا ہو جیسے

ہر گھڑی تیری لگن ہے تجھے پانے کا خیال
دل بہرحال تجھے ڈھونڈ رہا ہو جیسے

یہ کسی سماعت ہے، یہ کسی بصارت ہے
ظلمت کے اندھیروں میں احساس بھی غارت ہے

تعمیر کے پردے میں تخریب کے منظر ہیں
بربادی کے ہر فن میں بس تم کو مہارت ہے

یہ روح کا میلا پن مائل بہ گنہ نظریں
یہ کسی نمازیں ہیں یہ کسی طہارت ہے

پیوند قبا پر ہیں اور لب پہ تبسم ہے
سجدے میں سر دیکھو یہ روح بصارت ہے

بازار ہو دنیا کا یا دل کا وہ سودا ہو
ہر شخص خیالؔ اب تو مصروفِ تجارت ہے
آپ میرے خیال کی تائید پر مجبور ہو جائیں گے۔

کنیز فاطمہ کرن، "زرگل" کی شاعرہ

کنیز فاطمہ کرن، ایک نہایت شائستہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ خانوادے کی رکن ہیں۔ بہت دنوں سے سڈنی آسٹریلیا میں آباد ہیں اور "بزمِ اُردو" کے تحت، سڈنی کو اُردو کا مرکز شعر وادب بنائے ہوئے ہیں۔ میں ان کو ان کے زمانہ طالبعلمی سے جانتا ہوں اور ان کی خوش ذوقی و تخلیقی صلاحیتوں کا معترف ہوں۔ جی تو چاہتا ہے کہ ان کا احوال، قدرے تفصیل سے لکھوں، لیکن ممکن نہیں ہو رہا ہے، اس لئے کرن کے بارے میں کچھ کرن ہی سے سن لیجئے۔

"میرے دادا تلاش معاش میں یوپی سے حیدرآباد گئے اور وہیں بس گئے لیکن ہمارے خاندان کا یوپی سے رشتہ قائم رہا" امروہہ میں اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد میں نے گوکل داس کالج مرادآباد میں انٹر میں داخلہ لے لیا۔ انٹر کرنے کے بعد میری شادی ہوئی تو میں حیدرآباد سے کراچی آ گئی۔ شادی کے بعد سینٹ جوزف کالج کراچی سے بی اے اور پھر کراچی یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ 1976ء میں ہم سڈنی آ گئے اور نئے ملک کی اجنبی فضا سے کچھ مانوس ہو گئے تو کچھ ہم خیال دوستوں کے تعاون سے 1986ء میں "انجمن ترقی اردو" قائم کی اور رسالہ "بزم اردو" نکالا۔ انجمن ٹوٹنے کے بعد بھی یہ رسالہ دس سال تک نکلتی رہی۔ اور اس کاوش میں میرے بڑے بھائی صدیق حسن رضوی (عاصیؔ) جو کراچی میں رہتے ہیں اور صاحب دیوان شاعر ہیں، میرے برابر شریک رہے۔

ڈاکٹر علی نے انگلینڈ سے ایف آر سی ایس کیا اور دس سال انگلینڈ میں کام بھی کیا تھا لیکن چونکہ ایم بی بی ایس کی تعلیم اردو میں حیدرآباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی میں حاصل کی

تھی اس لئے ان کا ادبی ذوق بہت اعلیٰ تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری آٹھ نو سالوں تک سائنسی موضوعات پر اردو میں سات کتابوں کی تصنیف و تالیف کی۔ ان میں سے چار کتابیں ''کائنات اور اس کے مظاہر''، ''فلسفہ و سائنس''، ''ذہن و دماغ''، اور ''عروجِ آدم'' شائع ہو چکی ہیں۔ سڈنی میں اس دور میں ادب شناس دوستوں کو مشاعروں کی کمی بہت محسوس ہوتی تھی۔ سڈنی میں ڈاکٹر بدر قادری کے گھر پہلے مشاعرے کا اہتمام ہوا تھا جس میں دوستوں سے کہا گیا کہ وہ اپنے پسندیدہ شاعر کا کلام سنا کر مشاعرے میں شریک ہوں۔ یہ مشاعرے بہت کامیاب رہے جس کے بعد نئے لکھنے والوں نے بھی سنجیدگی سے طبع آزمائی شروع کر دی۔ ان میں، میں بھی شامل ہوں۔

میرے بارے میں ''شعرائے آسٹریلیا'' میں جو کچھ چھپ چکا ہے، میں اس میں صرف اتنا اضافہ کرنا چاہتی ہوں کہ چونکہ میرے شوہر ماہر امراضِ چشم تھے اس لئے میں کراچی میں جن شعراء کو اس وقت آنکھوں کے سلسلے میں مشورے کی ضرورت ہوتی تھی وہ ان سے ملتے تھے اور ابتداء سے ہی مجھے ان سے تعارف کا شرف حاصل ہو گیا۔ جیسے جوشؔ ملیح آبادی، ادیب سہارنپوری، فرمان فتح پوری صاحب تو میرے استاد ہیں خوش قسمتی سے نجی محفلوں میں فیضؔ صاحب سے کئی مرتبہ ملاقات ہوئی، پھر 1976 میں آسٹریلیا آنے کے بعد جب ''انجمن ترقی اردو'' اور اس کے بعد ''اردو سوسائٹی'' بنائی تو ''مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں'' 1986-1996ء یعنی گیارہ سال تک میں رسالہ ''بزم اردو'' نکالتی رہی۔

تخلیقی عمل کے حوالے سے کنیز فاطمہ کرن، نظمیں، غزلیں، رباعیات، قطعات اور گیت بھی کچھ کہتی ہیں اور خوب کہتی ہیں۔ ویسے ان کی نظمیں بھی عموماً غزل نما ہوتی ہیں یعنی، ان کی نظمیں اپنی معنوی کلیت کے ساتھ ساتھ، احساس کے ایک رشتے سے مضبوطی

سے بندھی ہوتی ہیں اس لیئے، کنیز فاطمہ کرن کا شعری مجموعہ "زرگل"، تفصیلی بحث کا تقاضا کرتا ہے لیکن میں اس جگہ نمونے کے طور پر ایک مختصر نظم اور ایک مختصر غزل دے رہا ہوں، ان سے میرے رائے کی تصدیق ہو جائے گی۔

نظم "مہک"

تجھ سے جب مل کے میں آئی، میری آنکھوں کی چمک
میرے عارض کی دمک، دیکھ کے نظریں اُٹھیں
کتنی پیشانیاں سجدوں کی تمنا میں رہیں
کتنی بانہیں مجھے آغوش میں لینے کو بڑھیں
اُن کو کیسے ہوا معلوم کہ ویرانیٔ دل
اب تیری یاد سے آباد رہا کرتی ہے
ان کو کیسے ہوا معلوم کہ دل کی دھڑکن
رات دن صرف تیرا نام لیا کرتی ہے
جیسے مٹی میں اُٹھے چھینٹوں کی سنگ سوندھی مہک
پھول کے کھلنے سے گلشن میں رواں جیسے شبنم
شاید اُن کو بھی پہنچی تھی میرے خوابوں کی آنچ
شاید اُن کو بھی میری روح سے آتی تھی چمک
ایسے ہی جیسے مجھے اپنے بدن سے ہر دم
تیری خوشبو، تیری چاہت کی مہک آتی ہے

☆☆☆☆

زندگی خواب و حقیقت کا سفر ہو جیسے
کبھی ست رنگ، کبھی خاک بسر ہو جیسے
چاند کی کوئی کرن، شہر بدر ہو جیسے
شب کبھی اور کبھی شب کی سحر ہو جیسے
کس کی آمد ہے کہ تارے ہوئے روشن ہر سُو؟
کہکشاں پھیلی ہے یوں، راہ گزر ہو جیسے
چاند نے کس کے لئے بھیجیں روپہلی کرنیں؟
چاندنی کی چھٹکی ہے، دامانِ گہر ہو جیسے
چپے چپے پہ ہیں خوش رنگ کنول، مہکے ہوئے!
دل مرا آپ کی یادوں کا نگر ہو جیسے

گلنار آفرین، دردمند دل شاعرہ

تخلیقی صلاحیت رکھنے والے کسی شخص کے سلسلے میں یہ بات حیرت انگیز نہیں کہ وہ ایک سے زائد صنفِ سخن کو اظہارِ ذات کا ذریعہ بنانے پر قادر ہو۔ چنانچہ ایک دو نہیں درجنوں ایسے باصلاحیت افراد موجود ہیں جنہوں نے شاعری کی متعدد اصناف پر طبع آزمائی کی ہے اور ان میں سے ہر ایک نے اپنا ایک امتیازی نشان بنا لیا ہے۔ بعض تخلیق کار خصوصاً اردو شعراء میں اسے بھی ہیں جنہوں نے اردو تنقید کو بہت کچھ دیا ہے اور کئی ایسے نقاد بھی سامنے آئے ہیں جن کی شاعری بھی بہرحال قابلِ توجہ رہی ہے۔

مولانا حالی، مولانا شبلی سے لے کر فراق گورکھپوری و ڈاکٹر تاثیر تک اور سجاد باقر رضوی و مظفر حنفی سے لے کر انجم اعظمی و سحر انصاری تک بہت سے ایسے نام ہیں جو شاعری اور تنقید دونوں کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ البتہ احمد ندیم قاسمی کے سوا کوئی ایسا نہیں جو ایک نامور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجہ کا افسانہ نگار بھی ہو۔ اس سلسلے میں خواتین کے ناموں کو ذہن میں اُبھارے تو یہاں بھی صرف ایک نام ایسا نظر آتا ہے جو افسانے اور شاعری دونوں میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ میری مراد گلنار آفرین سے ہے کہ وہ شعر بھی خوب کہتی ہیں اور افسانے بھی اچھے لکھتی ہیں پہلے وہ افسانوں کا مجموعہ لے کر منظر عام پر آئی تھیں۔ پھر شعری مجموعے کے ساتھ سامنے آئی ہیں۔

گلنؔار کے شعری مجموعے کے جو اشعار میرے سامنے ہیں ان پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوا کہ ان کی شاعری، آج کی روشِ عام کی تقلید میں نہ تو مبہم و پیچیدہ علامتوں کی شاعری ہے اور دورِ ارتقا استعارات و کنایاتی کی بلکہ ان کی شاعری سچے جذبوں کے ارتعاش

کی شاعری ہے اور شاید اسی لئے ''از دل خیزو دل ریزد'' کے مصداق، قاری کے ذہن و دل میں آسانی سے اُتر جاتی ہے۔ مولانا حسرت موہانی کی یہ بات

شعر دراصل ہیں وہی حسرت
دل میں سُنتے ہی جو اُتر جائیں

اگر سچ ہے تو پھر گلنار کی شاعری اس سچائی پر پوری اُترتی ہے مثلاً ذیل کے چند اشعار دیکھئے

اپنی آنکھوں میں ترا حسنِ سراپا لے کر
میں چلی جاؤں گی اپنا غمِ تنہا لے کر

رنگ کیا کیا دکھا گیا اِک شخص
نقشِ حیرت بنا گیا اِک شخص

گلنار مصلحت کی زباں میں نہ بات کر
وہ زہر پی کے دیکھ جو سچائیوں میں ہے

جاگتی آنکھوں سے ہر رات میں سو جاتی ہوں
روز خوابوں کے جزیروں میں کوئی آتا ہے

گلنار کے ان اشعار میں یا اس طرح کے دوسروں اشعار میں جو یک بیک دل میں اُتر جانے والی ایک کیفیت پائی جاتی ہے وہ بے سبب نہیں ہے۔ ان کی شاعری دراصل ایک

دردمندو دل زدہ فنکار کی شاعری ہے۔ سب جانتے ہیں کہ دردمندی دل زدگی کی شاعری منطق وفلسفہ یا تامل وتفکر میں نہیں بلکہ گھوم پھر کر سچے انسانی جذبوں کی آغوش اور احساس کی وادی میں پناہ لیتی ہے گلنار کی ساری شاعری اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ وہ ایک غم دیدہ وستم چشیدہ دل کی آواز ہے ایسی آواز جو محبت اور صرف محبت سے عبارت ہے۔ یہ محبت جو گلنار کی ذات میں پوری کائنات کو سمیٹے ہوئے ہے۔ گلنار کی پناہ گاہ بھی اور قربان گاہ بھی، محبت ان کے من مندر کی ایسی دیوی ہے جس کی پرستش ان کی زندگی ہی نہیں ان کی زندگی کا حاصل بھی ہے۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید وہ محبت اور غمِ محبت کے باب میں اس طرح کے اشعار نہ کہہ سکتیں۔

گلنار ہر اک شعر سے ظاہر ہے ترا غم
اشعار کبھی یونہی سُنائے نہیں جاتے

ہر رات میں خوابوں کے جزیروں میں گزاروں
گلنار مرے دل میں یہ ارمان بہت ہے

گزر کے آتی ہوں میں غم کے ریگ زاروں سے
نظر اُداس ہے دل ہے دکھا ہوا میرا

مجھ کو مطلوب ہیں آیاتِ تمنا گلنار
میں محبت کے صحیفوں کا خُدا چاہتی ہوں

یہ پرسشِ احوال تو اِک رسم ہے ورنہ
لوگوں کو مرے حالِ پریشان کی خبر ہے

میرے اشعار میں احساس کی شدت کیوں ہے
کیسے سمجھاؤں مجھے تجھ سے محبت کیوں ہے

ان اشعار سے یہ بات بھی نمایاں ہوکر سامنے آتی ہے کہ گلنار کی شاعری میں عورت ہونے کا ایک بہت خوبصورت احساس مختلف رنگوں میں موجود ہے ان کا یہ ادعا کہ

کئی عکس نکھارے مری رعنائیِ فن نے
اِک رنگ نہیں، میں کئی رنگوں سے بنی ہوں

بے وجہ نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ نسائیت کا رنگ ان کے یہاں طرح طرح سے اُبھرا ہے اور بڑی فنکاری کے ساتھ اشعار میں سمو گیا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ان کی شاعری کے پردے میں عورت کی ایک بہت دل نواز اور پاکیزہ شبیہہ چُھپی ہوئی ہے۔ یہ شبیہہ اکثر تاک جھانک لگاتی ہے۔ چشمک کرتی ہے۔ عشق و عاشقی کے دیئے جلاتی بجھاتی ہے۔ پیار کی چاندنی بکھیرتی ہے حُسن پر جان وارتی ہے۔ عشق کو گلے کا ہار بناتی ہے، لیکن صرف اس حد تک جس حد تک مشرقی تمدن اس کی اجازت دیتا ہے اور مولانا حسرت کی بنا کردہ روایت ''اعتبار شانِ رسوائی'' کا بھرم قائم رہتا ہے۔ اس سلسلے میں چند اشعار دیکھتے چلیے:

جب تصور میں تم آؤ تو غزل ہوتی ہے
ہر غزل فکر کا اِک تاج محل ہوتی ہے

تری چاہتوں سے سنور گئے ہیں مرے جمال کے آئینے
میں گلاب بن کے مہک اُٹھی میں شفق کے رنگ میں ڈھل گئی

میں لہر بن کے گلے ملنے تجھ سے آؤں گی
تو اِک کنول کی طرح شہرِ آب میں رہنا

گزر کے آئی ہوں غم کے ریگ زاروں سے
نظر اُداس ہے دل ہے دکھا ہوا میرا

البتہ نفسیاتِ انسانی اور تقاضائے نسوانی کے ان عاشقانہ گیتوں سے یہ خیال کرنا کہ گلنار آفرین اپنے عہد، اپنے دور، اپنے ماحول اپنے گرد و پیش کی زندگی اور اس کی کرب ناکیوں سے بے نیازانہ گزر رہی ہیں، درست نہ ہوگا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ وہ ایک انسان دوست اور دردمند دل کی مالک ہیں۔ چنانچہ وہ انسانی دکھ سے آنکھ بند کر کے گزرنا بھی چاہیں تو نہیں گزر سکتیں یہ ضروری ہے کہ ان کا رجائی مزاج، زندگی کی تلخیوں اور چیرہ دستیوں کو، مایوسانہ لہجے میں بروئے کار لانے پر آسانی سے آمادہ نہیں ہوتا۔ ورنہ سچ یہ ہے کہ گرد و پیش کی زندگی پر ان کی نظریں پوری طرح جمی رہی ہیں اور انہوں نے زمانے کی ساری ناہمواریوں اور ناہنجاریوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے بلکہ بعض اشعار میں تو انہوں نے اپنے سامنے کی زندگی کی بعض ایسی سچی تصویریں کھینچ دی ہیں کہ آج کا پورا معاشرہ اپنی جملہ کج ادائیوں اور رستم رانیوں کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ ان تصویروں کو دیکھ کر گاہے آنکھیں نم ہو جاتی ہیں، گاہے دل مسوس اُٹھتا ہے اور گاہے آدمی

سسکیاں بھرنے لگتا ہے۔تغزل کے پیرائے میں یہ سب کچھ گلنار نے کیسے کیا ہے اس کا کچھ اندازہ شاید ذیل کے اشعار سے ہو سکے گا۔

شہر خوباں کی فضا کو یہ ہوا کیا گلنار
کوئی نغمہ ہے نہ آہٹ ہے نہ آوازہ ہے

چمن والو ضروری ہے کہ دستورِ چمن برتو
بہاریں آ بھی جاتی ہیں تو ویرانی نہیں جاتی

یہ دورِ ستم ہے کوئی جینے کا ہُنر سیکھ
جاں دینا مرے شہر میں آسان بہت ہے

ہائے یہ وقت کہ رشتوں کا تقدس نہ رہا
ہائے یہ دور کہ جو اپنے تھے بیگانے ہیں

یہ غزل کے اشعار ہیں میں نے اپنے اظہارِ خیال کو گلنار کی غزلوں ہی تک محدود رکھا ہے۔اگر ان کے دل گداز و جاں نواز، رنگِ تغزل سے ذرا دیر کیلئے الگ ہو کر ان کی اس رجائیت پسند طبیعت کا اندازہ کرنا ہو جس کے تحت انہوں نے کہا ہے

ظلمت و نُور میں ہے ربط و تسلسل کتنا
رات ڈھلتی ہے تو خورشید نکل آتا ہے
وداعِ مہر کا منظر کبھی نہیں دیکھا
میں گھر میں شام سے پہلے دیا جلاتی ہوں

تو پھر گلنار کی نظموں پر بھی خصوصاً ''لمحاتِ فکر''، ''علی شیرِ خدا''، ''پاسِ وفا''، ''رفاقت''، ''محبت کیوں''، ''سوچ کا زخم''، ''آخری خط''، ''مقتلِ جاں''، ''کراچی تہہ خاک''، ''شاعر مشرق''، ''یکم مئی''، ''۱۴ اگست''، ''ماممتا اور ماں'' کے عنوانات کی نظموں پر ایک نظر ضرور ڈالنی چاہئے، یہ نظمیں گلنار کی شاعری کو سدا بہار بناتی ہیں۔ اس کی گلرنگی و گلناری میں اضافہ کرتی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ لطف اندوزی کے ساتھ ساتھ اپنے قاری و سامع کو زندگی گزارنے اور زندگی سے آنکھ ملانے کا حوصلہ و سلیقہ عطا کرتی ہیں۔

ماہ لقا چندا بائی، کلاسیکی شاعری کا معتبر نام

ماہ لقا چندا بائی کا نام میرے ذہن میں مدتوں سے محفوظ ہے۔ لیکن ماہ لقا کی اہمیت کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب میں نے قدیم تذکروں کا جائزہ لینا شروع کیا یہ ۱۹۶۴ء کی بات ہے جب میں نے ''نگار'' کا تذکروں کا تذکرہ نمبر مرتب کیا۔ کئی تذکروں میں ماہ لقا بائی کا نام بطور شاعرہ نظر آیا۔ خصوصاً دکنی شعراء کے تذکروں میں قدرِ تفصیل سے دکھائی دیا۔ ماہ لقا چندا بائی ایک شائستہ گھرانے کی خاتون تھیں اور لکھنا پڑھنا ان کے خاندان کا وطیرہ تھا۔ لیکن اُن کے والدین کے معاشی حالات نے اس بات کی اجازت نہ دی کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکتیں۔ بعض تذکرہ نگاروں نے ان کا شمار بغیر کسی دلیل کے کسبی عورتوں میں کرلیا۔

ماہ لقا کا تخلص چندا تھا کسی نے ان کا ذکر چندا بائی ماہ لقا سے کیا ہے اور کسی نے ماہ لقا چندا بائی کے نام سے۔ بہر حال اُردو شاعری کی تاریخ میں خاتون شاعرہ کی حیثیت سے ان کا نام اور کام تادیر زندہ رہنے والا ہے۔ ان کا یہ شعر نوجوانی ہی سے میرے حافظے میں ہے

ہر کلی جان کو مٹھی میں لیئے بیٹھی ہے
پھول بننے کی تمنا میں جیئے بیٹھی ہے

یہ شعر ایسا فکر انگیز ہے اور اس میں اتنی سادگی سے انسانی فطرت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ مجھے میر تقی میر کا یہ شعر یاد آتا ہے

کہا میں نے کتنا ہے گُل کا ثبات
کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا۔

میر تقی میر کا شعر خوب ہے لیکن ماہ لقا بائی چندا کا شعر بھی کم تر درجے کا نہیں ہے وہ

اس شعر کے علاوہ اگر کچھ اور نہ کہتیں تو بھی تاریخ میں اُن کا نام زندہ رہتا اس لئے کہ بے شمار شاعر ایسے گزرے ہیں جو صرف ایک ایک یا دو دو شعروں کی بدولت زندہ ہیں۔

تذکروں میں تو ان کا ذکر بہت مختصر آیا ہے لیکن بیسویں صدی میں ان کی زندگی اور کام کی طرف توجہ کی گئی ہے۔ ''حیاتِ ماہ لقا'' کے نام سے غلام ہمدانی گوہر نے حیدرآباد دکن سے ۱۹۰۶ء میں ایک مختصر سی کتاب شائع کی ہے اس میں ان کے خاندانی حالات کے علاوہ شاعری کے مختلف نمونے ملتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صاحبِ دیوان شاعرہ تھیں اور ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کرتی تھیں۔ ان کی غزلیں چھوٹی بحروں میں ہوتی تھیں۔ اگرچہ ان کا دیوان مختصر ہے لیکن وزن رکھتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی زندگی اور فن پر اعلیٰ درجے کا کام کیا جائے۔ اور ان کے اوصافِ شاعرانہ کو سامنے لایا جائے۔

مخفی امروہوی، متاعِ مخفی کی روشنی میں

''متاعِ مخفی'' مخفی امروہوی کا پہلا مجموعہ کلام ہے اور ان کے شوہر جناب حامد امروہوی نے مرتب کیا ہے۔۔ ''متاعِ مخفی'' میں حمد ونعت اور غزلوں کے علاوہ امریکہ کی ایک ریاست شکاگو کی بعض اہم تقاریب و واقعات اور اشخاص سے متعلق تاثراتی نظمیں بھی شامل ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ چونکہ انہیں اپنے شوہر اور بچوں سے بے حد انسیت ومحبت ہے اس لئے بہت سی دعائیہ نظمیں اور قطعات بھی ان سب کیلئے تحریر کیۓ ہیں۔غرض داخلی اور خارجی زندگی کی خوبصورت اور عمدہ منظر کشی کا حامل یہ مجموعہ شعری ایک خاص مقام رکھتا ہے۔

دیارِ غیر میں مقیم شعراء اور ادبا کا سب سے بڑا مسئلہ اپنے وطن اور خاندان کی یاد اور تعلق کا شدید احساس ہے یہ احساس ان کی شاعری میں غالب عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ''متاعِ مخفی'' میں ہمیں ایسے بہت سے اشعار مل جاتے ہیں۔مثلاً

خدا کا شکر ابھی تک تو مان باقی ہے
پُرانے شہر میں اپنا مکان باقی ہے

بسا لائے . سانسوں میں ہم اس کی خوشبو
مہکتا ہوا گلستان چھوڑ آئے

''متاعِ مخفی'' کے بغور مطالعے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ شاعرہ نے اپنے سادہ اور سچے جذبات کو خالصتاً انسانی لہجے میں غزل کی صنف کے تقاضوں کی روشنی میں پوری شعری مہارت اور فنی پختگی کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے کہ پڑھنے والا خود یہ محسوس کرنے لگا ہے جیسے یہ جذبات واحساسات اور واردات وکیفیات خود اس کی اپنی ہیں اور یہ کسی شاعر

کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ شاعری اس قدر سبک، سادہ ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں اُتر جاتی ہے۔ مثلاً ان کی یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

جو ساحل سے تماشا دیکھتے ہیں
انہیں طوفاں کا اندازہ نہیں ہوتا

جذبۂ عشق مزا تو جب ہے
مجھ کو وہ جانِ زمانہ ڈھونڈے

وہ تصور میں جب نہیں ہوتے
روز و شب روز و شب نہیں ہوتے

ہر کسی پر یہ کرم نہیں ہوتا
محرمِ راز سب نہیں ہوتے

وہ منانے سے کہا مانے گا
روٹھنے کا جو بہانہ ڈھونڈے

کسی کے لالہ و گل پر نگاہ کیا ڈالوں
مجھے خود اپنے چمن کی بہار کافی ہے

زمین قدموں کے نیچے سے کھینچے والوں
ہمارے سر پہ ابھی آسمان باقی ہے

مرے آنسوؤں کی روانی سے پوچھو
کہ آنکھوں سے ہوتی ہے برسات کیسے

اکیلے بارِ محبت اُٹھا نہ پاؤ گے
شریکِ راز بنا لو کہ درد بٹ جائے

ہے شہرِ دل میں بس جانا تو آساں
مگر جانے کا دروازہ نہیں ہے

چونکہ مخفی امروہوی کو فطری طور پر غزل کی صنف سے رغبت ہے لہٰذا انہوں نے خالص غزل کے لہجے میں روایتی مضامین و موضوعات کو بڑی خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں اس طرح بیان کر دیا ہے کہ پڑھتے پڑھتے گمان ہونے لگتا ہے کہ یہ تو خود ہمارے احساسات و جذبات کی ترجمانی ہو رہی ہے۔ ان کا لب ولہجہ سادہ اور پُر کار اور زبان مفرس اور معرب الفاظ کے بجائے روزمرہ کی بول چال سے قربت رکھتی ہے۔ ان کا شاعرانہ ڈکشن اردو کی دوسری خواتین شعراء سے قطعی منفرد اور اچھوتا ہے۔

ان اشعار کی روشنی میں کہنا پڑتا ہے کہ مخفی امروہوی کا ''مجموعہ شعری'' ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ان کی اپنی زندگی مع افرادِ خانہ ان کے گرد وپیش کے واقعات و حالات اور خود ان کی اپنی داخلی و خارجی کیفیات و واردات کے نقوش پوری وضاحت کے ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں۔ بلا شبہ ''متاعِ مخفی'' ایک اچھا اور معیاری شعری مجموعہ ہے اور عصری نسائی شاعری میں منفرد مقام رکھتا ہے۔

نجمہ عثمان، روشن خیال شاعرہ

نجمہ کی شاعری ذات کا نوحہ ہے اور حالات کا آئینہ ہے، نجمہ ایک روشن خیال اور دردمند دل رکھنے والی خاتون ہیں، مجموعی طور پر ان کی شاعری میں ایک شدید احساسِ غم ہے، میں صرف اس قدر اضافہ کروں گا کہ شاعری جنم ہی لیتی ہے شدتِ احساس سے، کربِ اندروں سے، دروں خانہ کے ہنگاموں سے باطن کے تلاطم سے، کسی شدید اور گہرے دباؤ سے، البتہ اظہار کیلئے ہنرمندی کی ضرورت ہوتی ہے، اور ان کے کلام کے مطالعے سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے، شاعرہ کے فکر و نظر کی دنیا زندگی کے کڑے موسموں کی زد پر ہے، لیکن یہ موسم زدگی شاعرہ کو مایوس کر دینے کی طاقت نہیں رکھتی، اسے یقین ہے کہ اگر موقع ملا تو وہ درخت جو کڑے موسموں کی زد پر ہے بہار آئی تو یہ پھول خوش نما دے گا، چنانچہ نجمہ کے ہاں اشعار بڑے سلیقے سے اُترتے ہیں، گویا نجمہ میں شعر کہنے کا طبعی سلیقہ ہے اور جب آدمی کو کسی کام کرنے کا یا ہنرمندی کے اظہار کا سلیقہ ہو تو پھر وہ میر کی ہم کلامی کا مدعی بھی ہو جاتا ہے۔ میر نے کہا تھا

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

یہ سلیقہ قہر و مہر دونوں کے اظہار کیلئے ضروری ہوتا ہے، دوستی اور دشمنی دونوں میں تہذیبی آثار پیدا کر دیتا ہے۔

مجھے سلیقۂ جور و ستم بھی ہے منظور
تمہیں بھی کاش سلیقہ ہو دشمنی کیلئے

نجمہ نے اپنے شعری مجموعے کا آغاز اس دعا سے کیا ہے

میرے خدا، مرے مولا،
بس اِک دعا ہے مری،
میں چاہتی ہوں کہ احوال روز و شب لکھوں،
جو سوچتی ہوں میں خلوت میں آج سب لکھوں،
مگر میں اک تہی الفاظ و کم سخن عورت،
خموش لب لئے اک خیمۂ صدا میں اسیر،
یہ چاہتی ہوں غزل میں سر قدیم و جدید،
میں اپنے حرف لکھوں اور سرخرو ہو جاؤں،
مرے خدا، مرے مولا،
بس اِک دعا ہے مری،
سخن وروں کے مقابل مجھے سخن ور کر
میری آواز منفرد ہو مگر
میرا احوال کائناتی ہو

آدو بُکا کی سرحد سے اُدھر اپنے ہونے کی شہادت دے اور میں اپنے جذبات کا اظہار کروں۔

فکر انگیز شعر، سوچتے جائیے، معنی کھلتے چلے جاتے ہیں۔

اس نے آزاد کر دیا مجھے
قید تنہائی پھر بھی باقی ہے

وہ ازل سے مری پناہ میں ہے
میرے اطراف جس کے لشکر ہیں

اسی جانب رواں بادل تھے نجمہ
جہاں پر کوئی بھی پیاسا نہیں تھا

سچے اور شدید محسوسات وجذبات کی شاعری سادہ وپُر کار فارسی تراکیب سے مزین ہے

وہ اِک شجر جو کڑے موسموں کی زد پر ہے
بہار آئی تو یہ پھول خوشنما دے گا

میں اپنی دھن میں اکیلی کہاں چلی آئی
یہاں تو مجھ سے گلے مل رہی ہے تنہائی

یہ کیسا تحفۂ آوارگی دیا ہے مجھے
ترے خیال کی خوشبو ہے کتنی ہرجائی

اس کی گلشن نژاد قربت سے
میں مجسم بہار آئی ہوں

سوچا کئے جو بات وہ لکھی نہ جاسکی
دل کی حکایتوں کا قلم ترجماں نہ تھا

وہ تو صحرا سے دھوپ لے آیا
میں نے تھوڑی سے چھاؤں مانگی تھی

تیرگی کو مٹا کے کیا کرتے
اپنا ہی گھر جلا کے کیا کرتے

جب سے سچ کا پیٹر پھل دینے لگا
میرا آنگن پتھر ٫ں سے بھر گیا

غزل، فکر وخیال کی ندرت ورعنائی کے ساتھ ساتھ زباں وبیاں کے ایک خاص رکھ رکھاؤ اور طرزِ ادا کی مخصوص کلاسیکی روش کا بھی مطالبہ کرتی ہے اور یہ اوصاف کسی شاعر میں ماحول کی پاکیزگی اور ذہن کی شائستگی سے پیدا ہوتے ہیں، نجمہ عثمان کے مزاج میں اس پاکیزگی اور شائستگی کے آثار صاف نظر آتے ہیں۔ ان اشعار کی سبک روی ونغمگی اور ان کے طرزِ کلام کی سادگی صاف بتاتی ہے کہ وہ مصنوعی لفظی پیکروں سے بہت الگ ایک سچے اور روشن خیال شاعر کی حیثیت سے اپنی الگ شناخت رکھتی ہیں۔ چند اشعار دیکھئے:

دل دریچے سے جھانکتی ہوں میں
سوگئی رات جاگتی ہوں میں
یاد کے گہرے پانیوں کے بیچ
دل کی کشتی اُتارتی ہوں میں

جانے کس کا عکس مجھ میں دیکھ کر
مجھ سے پہلی بار وہ ہنس کر ملا

سنو میں زندگی کی ظلمتوں میں
صداقت کے اُجالے بو رہی ہوں
ہوا کے دکھ کی چادر اُوڑھ لی ہے
بچھا کر آنسوؤں میں سو رہی ہوں

مندرجہ بالا اشعار اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ نجمہ عثمان کی سوچ بھی قابلِ تحسین ہے اور ان کی سوچ کا طرزِ اظہار بھی لطف آ ثار ہے۔ زبان کی صفائی و سادگی، بیان کی شیرینی و دل نشینی، حُسن بیان کا اہتمام، خیال کی پاکیزگی، معنی آفرینی، سوز و گداز اور رفعتِ مضمون وغیرہ ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

نسیم سید، احساسِ غم کی شاعرہ

نسیم سید کی شاعری بنیادی طور پر محسوسات یا احساسات کی شاعری ہے۔ احساسات کی شاعری کہنے سے میری مراد یہ ہے کہ ان کیفیات کی شاعری ہے جو اپنے اعمال و اثرات میں راست و شعوری ہیں۔ یعنی احساس و ادراک کے فوراً بعد کا عمل ہے اور مہیج کے موجود ہونے تک برقرار رہتا ہے۔ مہیج کی موجودگی یا اس کا تصور احساس کو دوبارہ زندہ کر دیتا ہے یاد یا میموری دراصل اس احساس کو جگانے ہی کا کام کرتی ہے یعنی گزشتہ تجربات کی بازیافت یا ماضی کو حال سے ملانے والی کیفیت کا نام ہے۔ یہ فریضہ شاعری کی زبان میں نسیم سید کے ہاں نہایت خوبصورتی سے ادا ہوا ہے لیکن یادِ ماضی یا تلخ تجربات کی بازیابی کے حوالے سے نسیم سید کی شاعری بحیثیت مجموعی محض احساس کی شاعری نہیں بلکہ احساسِ غم کی شاعری ہے۔ لیکن نسیم سید کے شعور نے غم کو اپنی شاعری پر مسلط نہیں ہونے دیا۔ ان کی ساری شاعری میں نظمیں ہوں یا غزلیں غم کا ایک نشاط افروز نغمہ جاری نظر آتا ہے۔ یاس و بے دلی کا طوفان اُمنڈتا ہے لیکن نسیم سید کا رجائی مزاج اس طوفان پر آسانی سے قابو پالیتا ہے۔ تبھی تو وہ کہتی ہیں

احساس کو ملتی نہیں اظہار کی خلعت
لفظوں کی اگر دھار پہ کٹ کر نہیں دیکھا
رستہ کوئی معیار سے ہٹ کر نہیں دیکھا
قامت سے کسی سائے کے گھٹ کر نہیں دیکھا

جیسا کہ اُوپر کہا گیا ہے کہ نسیم سید کے تجربات کتنے ہی غم دیدہ اور غم چشیدہ کیوں

نہ ہوں زندگی کے تلخ تجربات کے باوجود ان کی شاعری کا لہجہ المناک اور الم افزاء نہیں ہونے پاتا بلکہ ہر حال میں جینے کا حوصلہ دیتا ہے۔زندگی کا احساس گاہے گاہے ماضی کے تلخ تجربات کی بناء پر اسے خوف زدہ کرتا ہے۔ڈراتا ہے لیکن اس کا شعور اسے سنبھال لیتا ہے کس طرح اور کس انداز سے سنبھالتا ہے اس کی گواہی نسیم سید کے درج ذیل اشعار سے ملتی ہے

میں جب بھی خوف کے لشکر کو زیر کر آئی
نئی زمیں میرے پیروں تلے اُبھر آئی
یہ سوچ کر کہ زمانہ ہوا دعا بھی نہ کی
دعا کو ہاتھ اُٹھائے تو آنکھ بھر آئی
آدابِ ضبطِ عشق نہ رُسوا کرے کوئی
اپنی بساط دیکھ کر سودا کرے کوئی
ایسا نہ ہو کہ ضبط کے آداب سے بھی جائیں
اس درجہ التفاف نہ برتا کرے کوئی

نسیم سید کی شاعری میں خود اعتمادی اور رجائت ہے۔ان کے دوسرے شعری مجموعہ کا نام ہے ''آدھی گواہی'' یہ کلی سچائی پر مبنی حیرت انگیز نظم ہے اور اس امر پہ دلالت کرتی ہے کہ وہ سوچنے والی اور کھلی آنکھوں والی شاعرہ ہیں اس نظم پر ایک نظر ڈالتے چلیے۔

عظیم منصف

ہماری قسمت کی ہر عدالت کا فیصلہ ہے
کہ ہم
جب اپنے بدن کی

بے حرمتی کی

فریاد لے کے جائیں

تو اپنا کوئی گواہ لائیں

''گواہ'' ایسی گھڑی کا

جب وحشتوں سے

وحشت پناہ مانگے

''گواہ''

ایسے گناہ کا

جس کے تذکرے سے

گناہ کانپے

ہمیں کوئی ایسا معجزہ دے

کہ۔۔۔گونگی، اندھی، سیاہ شب کو

گواہیوں کا ہنر سکھائیں

بصیر ہے تو

خبیر ہے تو۔۔۔۔تجھے خبر ہے

کہ آج تک

موت کے علاوہ

کوئی نہ اپنا گواہ پایا

ہمیں پہ ٹوٹیں قیامتیں بھی

ہمیں نے ذلت کا بار اُٹھایا
کتابِ انصاف کے مصنف
ترے صحیفے
زبور و انجیل ہوں کہ تورات
عورتیں سب کی ذی شرف ہیں
سب اپنی اپنی کتاب کی رو سے
اپنے بارے میں باخبر ہیں
فہیم ہیں۔۔۔۔ بالغ النظر ہیں
گواہیاں سب کی معتبر ہیں
تو پھر ہمارے ہی پشت پر ہاتھ کیوں بندھے ہیں
ہماری ہی سب گواہیوں پر
یہ بے یقینی کی مہر کیوں ہے
سبھی صحیفوں میں یہ لکھا ہے
ترے ترازو کا کوئی پلڑا جھکا نہیں ہے
تو کیا یہ سمجھیں؟
ہمارا کوئی خدا نہیں ہے؟

اس نظم کے آخری مصرعوں سے جو تاثر میں نے قبول کیا۔ اس تاثر نے مجھ سے فی البدیہ یہ مندرجہ ذیل اشعار کہلوائے۔ یہی اشعار میں نسیم سید کی نذر کرتے ہوئے اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

نہیں خدارا نسیم سید
نہ ایسا سوچو نہ ایسا سمجھو
قسم خدا کی نسیم سید
تمہارے سر پر بھی اک خدا ہے
جو نا خدا بھی ہے اور خدا بھی
جو دہخداؤں کے خلق کردہ
خدا کے قد سے بہت بڑا ہے
جو اُس خدا سے عظیم تر ہے
جو رہخداؤں کا ساختہ ہے
جو اپنے ہاتھوں میں فکر و فن کے لئے ترازو
مثالِ انصاف بوزنائی
کسی کو آدھی
کسی کو پوری گواہی تقسیم کر رہا ہے
اجارہ دار سزا جزا بن کے خود کو جاہل
غذائے دوزخ بنا رہا ہے
نسیم سید یقین جانو
تمہارے سر پر بھی اِک خدا ہے
جو دہخداؤں کے خلق کردہ خدا کے قد سے
بہت بڑا ہے بہت بڑا ہے

نسیم کلثوم، غمِ نشاط کی شاعرہ

اس وقت محترمہ نسیم کلثوم کا شعری مجموعہ ''نشاطِ غم'' میرے سامنے ہے اور اسی کی رعایت سے اس ترکیب کی مقلوب صورت ''غمِ نشاط'' خود بخود ذہن میں اُبھر آئی ہے، اس میں شبہ نہیں کہ دونوں بہت خوبصورت ترکیبیں ہیں اور لفظی مماثلت کے باوصف اپنی اپنی جداگانہ مقبولیت رکھتی ہیں۔

''غمِ نشاط'' اشاریہ ہے حسرت ویاس کا، الم ناکی ودل گرفتگی کا، خزینہ ہے وفور جذبات کا اور وارفتگی جاں کا، اس کے برعکس نشاطِ غم کی ترکیب نمائندگی کرتی ہے کیفِ دردِ پنہانی کی سرور وسوزِ روحانی کی، الم ناکی وغم گستی نے کی اور زمانے کی رستگاری کی اور ناہنجاریوں سے نبرد آزمائی کی۔ چند اشعار دیکھئے۔

ہائے تم روٹھ گئے اور یہ سوچا ہی نہیں
میں نے تم بن کوئی خوش وقت گزارا ہی نہیں

تم سے تابندہ رہی اپنی ہر اِک راہِ حیات
لیکن ان راہوں میں اب کوئی اُجالا ہی نہیں

تم نے ویران نگاہوں کا نظارہ تو کیا
ان میں جو درد تھا پنہاں اسے دیکھا ہی نہیں

زندگی کس کے سہارے پہ گزارو گی نسیم
جب زمانے میں تمہارا کوئی اپنا ہی نہیں

اپنے سفرِ حیات میں نسیم کلثوم کے رجائی مزاج اور حوصلہ مند طبیعت نے غمِ نشاط نہیں نشاطِ غم کو راہبر اور شجر سایہ دار جانا ہے۔ کٹھن سے کٹھن مرحلوں کو نشاطِ غم کی رہنمائی اور دستگیری میں طے کیا ہے اور غمِ نشاط سے بے نیازانہ گذر کر نشاطِ غم کی لازوال دولت و منصب تک پہنچی ہیں چند اشعار دیکھتے چلئے۔

موت کی تاریکیاں یکدم منور ہوگئیں
وقتِ آخر وہ مرا ماہِ تمام آ ہی گیا

آج اس نے پرسشِ احوالِ غم اس طرح کی
بے وفا کا میرے دل میں احترام آ ہی گیا

عشق کو ہوتا نہیں احساسِ محرومی جہاں
تیری اُلفت میں ستمگر وہ مقام آ ہی گیا

میں نے دیکھی ہے شعاعِ غم اُن آنکھوں میں نسیم
طائرِ زیرک بھی آخر زیرِدام آ ہی گیا

مجھے نسیم کلثوم کے مجموعہ کلام ''نشاطِ غم'' پر نظر ڈالتے ہوئے اندازہ ہو گیا تھا کہ انہیں فطرت سے دردمند دل عطا ہوا ہے اور وہ اس عطائے غیبی پر خالق کائنات کے حضور شکر گزاری کے جذبات کے ساتھ سجدہ ریزی کو حاصلِ حیات جانتی ہیں ان کے اس ذوقِ عبادت نے مجھے فانی کا یہ شعر یاد دلایا کہ

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم، جو تو نے دیا دل دکھا ہوا

لیکن فانی اور نسیم کلثوم کی درد مندی اور اس درد مندی کے حاصل کی نوعیت و کیفیت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ نسیم کلثوم کو یہ درد مندی مسائل سے مسلسل دست و گریباں رہنے کے طفیل ہاتھ آئی ہے جبکہ فانی نے اپنی سرشت مزاج کے زیر اثر اسے اپنے اُوپر طاری کر لیا تھا۔ نتیجتاً فانی عموماً یاس و نا اُمیدی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اسی لئے ان کے بیشتر کلام پر مایوسی اور حرماں نصیبی کا عنصر حاوی نظر آتا ہے، اس کے برعکس نسیم کلثوم کی رجائی طبیعت اپنے آپ کو دائمی غمگینی و مایوسی کے قریب نہیں آنے دیتی اور زندگی کے مشکل مرحلوں سے نبرد آزما ہو کر بہر حال حوصلہ مندی کا دامن تھامے رہتی ہے اور غمِ نشاط کی نوحہ گری کے بجائے نشاطِ غم کی رجز خوانی کرتی رہتی ہے۔ نسیم کلثوم کا سارا کلام اس رجز خوانی کا مظہر ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی عمر کی آخری منزلوں میں بھی غالب کے اس شعر کی ہم نوائی کرتی نظر آتی ہیں۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

نسیم کلثوم کے چند اشعار دیکھئے

تنہائی کے دن اپنے کیسے میں بتاؤں گی
جو بیت گئی مجھ پر کیسے میں بھلاؤنگی

بکھراؤں گی راہوں میں پھر پیار کے میں موتی
آنکھوں میں چھپاؤں گی اور دل میں بٹھاؤں گی

اپنے تہی دامن میں اپنے دلِ مفلس میں
اس درد کی دولت کو کیونکر چھپاؤں گی

جز جور و ستم ان سے کچھ بھی تو نہیں پایا
پر عہد وفا اپنا تا زیست نبھاؤں گی

کس طرح نسیم اپنے لٹنے کا بیاں لکھوں
کیا اپنی تباہی کا خاکہ میں اُڑاؤں گی

دوستوں کا کہنا تھا اب یہ جی نہیں سکتی
دیکھو کتنی ہمت سے زندگی گزاری ہے

خود ہی تو کیا افشا رازِ دل کو شعروں میں
کیوں نسیم اس کی اب اتنی شرمساری ہے

لے کر ہزار شکوے پیش حضور جانا
اور سامنے جب آئیں کوئی گلہ نہ کرنا

دنیا میں دوست سچا ملنا بہت ہے مشکل
مل جائے کوئی ایسا اس کو جُدا نہ کرنا

تم وفا نا آشنا ہو یہ سمجھ پائے نہ ہم
سادگی میں ایک ربط بے گماں رکھتے رہے

کون سمجھے گا میرے طرزِ محبت کو نسیم
وہی محبوب بنا جس کو نہ پایا میں نے

وہ میرے پیار کو دیوانگی سمجھ بیٹھے
مرے خلوص کو بے چارگی سمجھ بیٹھے

یہ اشعار ان خصوصیات کی گواہی دیتے ہیں جن کا میں نے اُوپر کی سطروں میں ذکر کیا ہے۔

نوشی گیلانی، حوصلہ مند شاعرہ

نوشی گیلانی اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے شعبہ اردو میں استاد ہیں۔ نثر بھی لکھتی ہیں، شعر بھی کہتی ہیں خود بھی بہت پڑھتی ہیں اور پڑھاتی بھی ہیں گویا شعروادب کا میدان اُن کے گھر کا آنگن ہے۔

ان کے کلام کی روانی اور بیان کی شگفتگی صاف ظاہر کرتی ہے کہ ان کی شاعری ذہنی ریاضت کا نتیجہ نہیں بلکہ دورُونِ خانہ کے ہنگاموں کے دباؤ کا حاصل ہے اور نہایت سادگی و خوبصورتی سے لفظوں میں ڈھل گیا ہے۔ چند اشعار دیکھئے۔

رکتا بھی نہیں ٹھیک سے چلتا بھی نہیں ہے
یہ دِل کہ تیرے بعد سنبھلتا بھی نہیں ہے

یہ شہر کسی آئینہ کردار بدن پر
الزام لگاتے ہوئے ڈرتا بھی نہیں ہے

اِک عمر سے ہم اس کی تمنا میں ہیں بے خواب
وہ چاند جو آنگن میں اُترتا بھی نہیں ہے

پھر دل میں تیری یاد کے منتظر ہیں فروزاں
ایسے میں کوئی دیکھنے والا بھی نہیں ہے

اس عمر کے صحرا سے تیری یاد کا بادل
ٹلتا بھی نہیں اور برستا بھی نہیں ہے

ہمراہ بھی خواہش سے نہیں رہتا ہمارے
اور بامِ رفاقت سے اُترتا بھی نہیں ہے

نوشی گیلانی کے شعری پیکروں میں معنی کی عجیب وغریب خوشبو ہے، پھُولوں کی، رنگوں کی، تتلیوں کی، جذبوں کے صداقت کی، احساس کی لطافت کی اور سوچ کی پاکیزگی و بلندی کی، پھر چونکہ ان کی شاعری میں ہوا اور موجِ ہوا کے استعارات کو خاص دخل ہے، اس لئے یہ خوشبو اُڑی اُڑی پھرتی ہے اور قاری کے جسم و جان کے در و بام کو معطر کر جاتی ہے۔
مثلاً

اس دل کے چند اثاثوں میں اِک موسم ہے برساتوں کا
اک صحرا ہجر کی راتوں کا، اِک جنگل وصل کے خوابوں کا

اُس چودھویں رات کے سائے میں جب آخری بار ملے تھے ہم
یہ دل پاگل کب بھُولتا ہے وہ باغ سفید گلابوں کا

ہم لوگ جنوں کے عالم میں منزل کی طلب بھی بھُول گئے
اب دل کو بھلا سا لگتا ہے، صحرا میں عکس سرابوں کا

نوشی گیلانی کہتی ہیں

اپنی عمر گنوا دی پھر بھی
بستی کے سب لوگوں نے
مجھ کو

یا تو پتھر سمجھا

یا پھر موم کی گڑیا

بدگمانی کے سرد موسم میں

برف گرتی رہی بدن پہ مرے

اور سینے کے ساتھ لپٹی ہوئی

میری گڑیا کے ہاتھ نیلے ہوئے

یوں لگتا ہے جیسے ایک نوعمر لڑکی پرِ زاغ ہاتھ میں لے کر ہوا کے رُو برُو کھڑی ہے۔ گڑیا کے ہاتھ نیلے پڑ چکے ہیں مگر اُس کی آنکھوں میں چمک موجود ہے، پھول ہیں کہ پتی پتی اور تتلیاں ہیں کہ رنگ برنگ خود کو سمیٹے ہوئے ہیں لیکن خوشبو ہے کہ پھیلتی چلی جا رہی ہے اور رنگ ہے کہ حواس پر چھاتا جا رہا ہے، خدا کرے نوشی کی شاعری کا یہ موسم روز بروز نکھرتا جائے اور دائمی بن جائے۔ ایک اور نظم دیکھتے چلیے۔

کتنا سہل جانا تھا

خوشبوؤں کو چھو لینا

بارشوں کے موسم میں شام کا ہر اک منظر

گھر میں قید کر لینا

روشنی ستاروں کو مٹھیوں میں بھر لینا

کتنا سہل جانا تھا

خوشبوؤں کو چھو لینا

جگنوؤں کی باتوں سے پھول جیسے آنگن میں

روشنی سی کر لینا

اس کی یاد کا چہرہ خوابناک آنکھوں کی

جھیل کے گلابوں پر دیر تک سجا رکھنا

کتنا سہل جانا تھا

اے نظر کی خوش فہمی! اس طرح نہیں ہوتا

تتلیاں پکڑنے کو دور جانا پڑتا ہے

نوشی گیلانی کے بعض ہم عصر شاعروں اور نقادوں نے ان کی شاعری کو آوارہ خیالی اور فکری گمراہی سے تعبیر کیا ہے حالانکہ یہ گمراہی اور آوارہ خیالی شاعرہ کی نہیں بلکہ ان حسدانہ نگاہوں کی بے رحمی کا نتیجہ ہے جو نوشی گیلانی کو پوری ذہنی اور فکری آزادی کی ساتھ فن کاری کے میدان میں اُڑان بھرنے کی اجازت نہیں دیتے۔

وحیدہ نسیم اور اُن کی شاعری

دکن کا علاقہ اُردو شعر و ادب کا قدیم ترین مرکز ہے۔ اُردو شاعری کی اوّلین قابلِ توجہ شاعرہ مہ لقا چندا بائی کا تعلق بھی دکن سے ہے اور ادب اور سائنسی علوم سے آراستہ ذہن رکھنے والی شاعرہ وحیدہ نسیم بھی یہیں سے تعلق رکھتی ہیں۔

یوں تو اُردو شعر و ادب کے حوالے سے وحیدہ نسیم کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں پھر بھی مجھے اس جگہ مزید کچھ کہنا ہے وہ فکشن اور شاعری دونوں حوالوں سے اپنی شناخت رکھتی ہیں۔ نظم و غزل دونوں کہتی رہیں۔ اُن کے کلام کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے گرد و پیش کی زندگی کے سارے مناظر سے خود کو منسلک رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی نظموں کے موضوعات یک رنگ نہیں بلکہ زندگی کی طرح رنگا رنگ ہیں۔

شخصی موضوعات یعنی کسی فرد یا شخصیت کے بارے میں بھی انہوں نے بہت اچھی نظمیں کہی ہیں۔ اگرچہ یہ کام آسان نہیں مشکل ہے لیکن وحیدہ نسیم کے یہاں کئی اشخاص پر عمدہ نظمیں ملتی ہیں۔ ہر نظم کا انداز متعلقہ فرد کے اوصاف و خصوصیات سے اس طرح پیوست ہے کہ پڑھنے والا باآسانی متعلقہ شخصیت کے اوصاف سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً ان نظموں میں بہادر شاہ ظفر، ٹیپو سلطان کے مزار پر چند لمحے، شہیدِ ملت، اقبال کے حضور، بحضورِ قائدِ اعظم، مادرِ ملت کی وفات پر، نذرِ غالب، ملکہ برطانیہ اس سلسلے میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان نظموں کے علاوہ ان کی دیگر نظموں کے موضوعات بھی عمدہ ہیں۔

وحیدہ نسیم کی شاعری بہ اعتبار موضوع و مواد اور بہ لحاظِ اندازِ فکر و طرزِ بیاں منفرد رنگ و آہنگ کی شاعری ہے۔

وحیدہ نسیم کی شاعری فلسفہ وفکر کی شاعری نہیں بلکہ حقیقی جذبوں اور سچے محسوسات کی شاعری ہے۔ اس لئے ان کے ہاں دور اِز کار استعارات وعلامات کا انبار ہے جسے لفاظی کہہ لیجئے کہیں نظر نہیں آتا بلکہ زبان و بیان کا ہی اسلوب ان کی شاعری پر شروع سے آخر تک چھایا رہتا ہے جو سادگی باوصف غضب کی پُرکاری رکھتا ہے۔ نمونے کے طور پر ایک مختصر نظم اور ایک غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

یاد آتی ہیں لُطف کی باتیں
کاش آتیں نہ چاندنی راتیں

صبح خنداں میں اب وہ بات نہیں
شام کی رہ نہیں مداراتیں

پہلے تھیں بجلیاں تبسم کی
اور اب آنسوؤں کی برساتیں

زندگی تلخ ہے نسیمہ کیوں
کون جانے یہ راز کی باتیں

....

ایک تکمیل داستان کے لئے
دل نے ٹکڑے کہاں کہاں کے لئے

چند اشکوں میں رہ گئے ڈھل کر
حرف مطلب جو تھے زباں کے لئے

شمع کہتی اگر تو کیا کہتی
دورِ اُلفت نہ تھا بیاں کے لئے

یاسمین گل، اعتراف کی شاعرہ

یاسمین گل کا پہلا شعری مجموعہ ''اعتراف'' ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔ اس کی ایک کاپی مجھے برائے تبصرہ موصول ہوئی تھی۔ یہ ان کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ان کی ایک غزل جس کا مطلع ہے

یہ سورج کے ڈھلتے ہی کیا ہوگیا ہے، چلو چل کے دیکھیں!
فلک خون میں کیوں نہایا ہوا ہے، چلو چل کے دیکھیں!

مجھے بہت پسند آئی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے یاسمین گل کو ایک خط بھیجا جو ماہنامہ ''پذیرائی، لاہور'' میں شائع ہوا وہ خط اور مجموعہ کلام پر تبصرہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

عزیزہ من سلامتی اور دعائیں

''اعتراف'' کے عنوان سے آپ کا شعری مجموعہ اسی ہفتے ملا اور جسم و جاں کو تازہ ہوا کا ایک جھونکا دے گیا۔ میں شاعر نہیں لیکن شاعری میری کمزوری ہے کہ میں شاعری کے مطالعے کے بغیر رہ نہیں سکتا، عمر بھر شعر ہی پڑھتا رہا اور حسبِ توفیق ان کے بارے میں لکھتا رہا۔ اس سے کچھ اور ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، مجھے ایک طرح کا سکون و سرور ضرور میسر آیا ہے۔

''اعتراف'' کو میں نے ایک سانس میں پڑھ لیا۔ مراد یہ کہ ہر سانس دوسری سانس کیلئے حیات بخش رہی اور مطالعے کا تسلسل ٹوٹنے نہ پایا، پھر کتاب کی ظاہری سطحوں یعنی گرد پوش و پیشِ کلام وغیرہ پر نظر ڈالی، ہر چیز نظر میں کھبتی چلی گئی۔ پیش کلام میں اعتراف اور حسن اعتراف سے متعلق قاسمی صاحب کے اعترافات نے میرے خیال کو تقویت پہنچائی اور یقین آیا کہ میں نے آپ کے شعر پڑھ کر جو کچھ محسوس کیا ہے سچ محسوس کیا ہے۔ پیش کلام کے فوراً

بعد آپ کا یہ فقرہ ''میں ممنون ہوں...... سید سجاد باقر رضوی (مرحوم) کی''۔

میرے لئے کلکتے کا ذکر ثابت ہوا اور آپ نے ''وہ تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے'' بعد ازاں شعر و شاعری کی نبض شناسی کے باب میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ آپ کے سچے ذوق شعری و سخن وری پر دلالت کرتا ہے۔ شاعر کا کام معلومات فراہم کرنا نہیں محسوسات کی ترجمانی کرنا ہے۔ شاعری کا ضامن، علم نہیں احساس ہے اور احساس کی صورت یہ ہے کہ وہ فرد تا فرد ہی نہیں بلکہ ایک ہی فرد میں لمحہ بہ لمحہ بدلتا رہتا ہے۔ بہر حال یہ جان کر دل خوش ہوا کہ اللہ نے ''شعر گفتن'' و شعر فہمیدن، دونوں کی توفیق آپ کو بخشی ہے۔

گرد پوش کی دوسری جانب آپ کی تصویر کے نیچے یہ شعر درج ہے:

سوچ کی صورت خود کو بو کر
لفظ کی، صورت اُگ سکتی ہوں

بعض کم ذوق شاعر اسے اپنے آپ کی تعلیٰ سے تعبیر کریں گے لیکن اس نوع کی تعلیٰ عیب نہیں بلکہ ہنر اور اظہار ہنر کی ایک صورت ہے اور اعتراف کے مطالعہ کے بعد اس کی سچائی کا اعتراف بہر حال کرنا پڑتا ہے میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ آپ کی سوچ کچھ اس انداز کی ہے کہ وہ لفظ کی صورت میں صرف یہی نہیں کہ اُگ سکتی ہے بلکہ پروان بھی چڑھ سکتی ہے، پھل پھول دے سکتی ہے اور سبز پتوں سے لدی گھنیری شاخوں کا سایہ بھی فراہم کرسکتی ہے آپ نے غزل کے ایک شعر میں دعا کہ ہے کہ

لفظوں کی نبض ہاتھ میں دی ہے اگر تو پھر
مجھ بحر ناشناس کو ذوق بحور دے

آپ کو علم ہونا چاہے کہ یہ دعا تو بہت پہلے مستجاب ہو چکی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر،

اس نوع کا دعویٰ سچ پر مبنی نہ ہوتا کہ

جو منظر سامنے کا ہے بیان اس کو نہیں کرتی
میں جو محسوس کرتی ہوں اسی کی بات کرتی ہوں

آپ کی غزلوں کے جو شعر میرے دل کو لگے، ان میں چند یہ ہیں:

سب مکمل خط بھی اور مضمون بھی
صرف اِک باقی پتہ رہ جائے گا

کھینچی سی لاکھ میں بیٹھوں گی لیکن
مرا سنگھار سب کچھ بول دے گا

تم کہو میں اسے آنکھ نہیں کہہ سکتی
جس سے جذبات کی ترسیل نہیں ہو سکتی

طبع رنگین سہی اس کی مگر ہر لڑکی
پیرہن کی طرح تبدیل نہیں ہو سکتی

دل کے دربار سے ہوتے رہے جاری احکام
ذہن کہتا رہا تعمیل نہیں ہو سکتی

تھا جرم ایک سا لیکن رواتیوں کے طفیل
میں پائمال ہوئی اور وہ معتبر ٹھہرا

پہلے پہلے تو مجھے یہ بات انہونی لگی
رفتہ رفتہ راس پھر آنے لگیں بے خوابیاں

عجیب شخص ہے پاس آئے تو بکھر جائے
وگر نہ دور سے اکثر دکھائی دیتا ہے

یہ کس نشیب سے اُتری ہوں میں جہاں سے مجھے
وہ آسمان کے برابر دکھائی دیتا ہے

کہا احساس نے کوئی ہے شاید
نظر بولی، نہیں کوئی نہیں ہے

وہ اک پل چلی تھی کسی گلبدن کے ساتھ
خوشبو لپٹ گئی ہے میرے پیرہن کے ساتھ

تو سمجھتی ہے کتابوں میں بھلا دے گی مجھے
ہر ورق دیکھ لے ہر لفظ میں لکھا ہوں میں

ماں کہے جاتی ہے لے لو جو بھی شے اچھی لگے
کیا کہوں ماں سے بھرے میلے میں کیا اچھا لگا

جب دعا ہی رہ گئی سارے دکھوں کا اک علاج
اس گھڑی پہلے سے بھی بڑھ کر خدا اچھا لگا

خواب کی اپنی لذت ہے پر جانے کیوں
بعد میں آنکھیں ملنا اچھا لگتا ہے

تم جہاندار و جہاں دیدہ ہو لہرا کے چلو
مجھ کو وعدوں کی صلیبوں پہ گڑی رہنے دو

موسم گل میں نہ جانے کیا ہو بند قبا کے ساتھ
غنچے بھی کچھ سوچ رہے ہیں بادِ صبا کے ساتھ

آپ کی نظمیں غزل نما محسوس ہوئیں، اور ترکیبوں کا سارا نظام ان کی بندش اور مجموعی اثر پذیری بالکل غزل جیسی لگی۔ چھوٹی بحروں کی چھوٹی نظموں میں، نارسائی، تم کہو، برزخ، خوشی، خوشبوں کا سفر، محبت کی شرط، ابھی نہیں، بہت خوبصورت ہیں، قدرے طویل نظموں میں جبلتوں کی نفی کرنا، آثار قدیمہ، یہی تو شاعری ہے، محبت ایک مکالمہ، مائیکل انجیلو، کبھی جی چاہتا ہے، پچھتاوا اب کس لئے، یہ ماتم، ذرا سنو، دیکھیے، ہم گنہگار عشق ہیں مکمل نظمیں ہیں اور مکمل تاثر دیتی ہیں۔

آپ کا اصرار تھا کہ جو کچھ محسوس کیا جائے اسے ضرور لکھ دیا جائے اس لئے جو سمجھ میں آیا عجلت میں پڑھا اور عجلت میں لکھا کہ ہمارے شہر میں اطمینان سے پڑھنے اور اطمینان سے کچھ لکھنے کا اب موقع ہی نہیں رہا۔

بہارستانِ ناز

مصنف:

حکیم محمد فصیح الدین رنج ساکن میرٹھ۔

عہد تصنیف وطباعت:

''بہارستانِ ناز'' 1864 میں مکمل ہوا اور اسی سال مطبع دار العلوم میرٹھ سے شائع ہو گیا۔ 4 سال بعد 1868ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن اسی مطبع سے نکلا۔ 1882ء میں اس کا تیسرا ایڈیشن از سر نو تصحیح و تدوین کے بعد مطبع عثمانی میرٹھ سے چھپا۔ اسی تیسرے ایڈیشن کے مطبوعے نسخے کتب خانوں میں عموماً ملتے ہیں۔ اس کا ایک نسخہ انجمن ترقی اُردو کے کتب خانہ خاص میں بھی محفوظ ہے۔ اس میں کل 144 صفحات ہیں کتابت وطباعت بہت اچھی ہے۔ اس کے دیباچے اور خاتمہ میں مصنف نے اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ یہ تذکرہ اس سے پہلے 1864ء اور 1886 میں شائع ہو چکا ہے اور 1886ء میں تیسری بار میرٹھ کے مجسٹریٹ جارج آرٹسٹ وارڈ کی فرمائش واعانت سے طبع ہو رہا ہے۔

خصوصیات:

تذکرہ اردو میں ہے ابتدائی 16 صفحوں میں حمد و نعت منثور اور بعد ازاں شاعرات کی فہرست اور دیباچہ ہے اس میں مصنف نے تعلیم نسواں اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اندازِ بیان مسجع و مقفیٰ ہے۔ عبارت آرائی کی کوشش ہر جگہ ملتی ہے۔ صفحہ 17 سے اصل تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ اس میں 107 صفحات ہیں جو طبع اوّل، طبع دوم اور طبع سوم تینوں اشاعتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

شاعرات کے حالات زندگی بہت مختصر ہیں۔ کلام کا نمونہ بھی بہت کم دیا گیا ہے۔ اردو کلام کے ساتھ فارسی شاعری کا انتخاب بھی جگہ جگہ ملتا ہے اور بعض صورتوں میں اردو کے بجائے صرف فارسی کلام ملتا ہے۔ مثلاً وزیر النساء وزیر کے ذکر میں رنج نے دو فارسی غزلیں اور دو فارسی قصیدوں میں تشبیبیں بطور نمونہ نقل کی ہیں۔

اس میں حسب ذیل شاعرات کا ذکر آیا ہے۔

فہرست شاعرات

نمبر شمار	تخلص و نام		نمبر شمار	تخلص و نام	
۱	اختر	اختر محل بیگم	۱۲	آرزو	۔
۲	امراؤ	امراؤ جاں	۱۳	امانی	۔
۳	آتوتی	توتی آتون	۱۴	اشک	۔
۴	آقا	آقا بیگم	۱۵	امراؤ ثانی	
۵	آقا	بیگم ثانی	۱۶	امیر	امیر جان
۶	آرائش	۔	۱۷	اچپل	ھینگن
۷	اسیر	امیر بیگم	۱۸	بسم اللہ	
۸	امیر	۔	۱۹	بنّو	
۹	ارزوی	۔	۲۰	بادشاہ خاتون	
۱۰	امراؤ	۔	۲۱	بیدلی	
۱۱	آرام	۔	۲۲	بزرگی	

نمبر شمار	تخلص و نام	نمبر شمار	تخلص و نام
۲۳	بستی	۴۱	جمعیت
۲۴	بہو بیگم صاحبہ	۴۲	جمالی
۲۵	بیگم	۴۳	جمیلہ
۲۶	بیگم رشک محل بیگم	۴۴	جہاں آرا
۲۷	بچہ	۴۵	جہاں خاتون
۲۸	بدلا	۴۶	چندا
۲۹	پارسا	۴۷	چھوٹی
۳۰	پرتولی	۴۸	حیدری حیدری خام
۳۱	پری میجو	۴۹	حیا حیات النساء
۳۲	تسلی مناجان	۵۰	حجابی
۳۳	تصویر	۵۱	حیات
۳۴	ثنا	۵۲	حیات
۳۵	ثریا	۵۳	حیاتی
۳۶	جانی بیگم	۵۴	حاتم
۳۷	جہاں	۵۵	حجاب عسکری بیگم
۳۸	جعفری	۵۶	حجاب کشمیرن
۳۹	جینا بیگم	۵۷	حجاب نواب بیگم
۴۰	جان	۵۸	حسن وزیر جان

نمبر شمار	تخلص و نام	نمبر شمار	تخلص و نام
۵۹	حجاب منی بائی	۷۷	زہرہ نصیبن
۶۰	حشمت مہرجان	۷۸	زہرہ ثالث
۶۱	حور مناجان	۷۹	زہرہ لطیفن
۶۲	حیا حیات النساء	۸۰	سید بیگم
۶۳	خفی بادشاہ بیگم	۸۱	سلطان سلطانی بیگم
۶۴	خانزادی	۸۲	سردار سرداربیگم
۶۵	خاکساری	۸۳	سلطان خدیجہ سلطان
۶۶	خورشید	۸۴	شوخ
۶۷	دلہن دلہن بیگم	۸۵	شرم شمس النساء
۶۸	دوستی نسائی	۸۶	شیریں رضیہ سلطان
۶۹	دلبر چھوٹی بیگم	۸۷	شیریں بیگا
۷۰	دولت	۸۸	شرارت امیرجان
۷۱	ذلیل	۸۹	شریر جگن
۷۲	رعنائی قدسیہ بیگم	۹۰	شرم چھوٹی بیگم
۷۳	راویہ	۹۱	شیریں نواب شاہجاں بیگم
۷۴	زہرہ امراؤجان	۹۲	شیریں شیریں وحید
۷۵	زینت زینت جاں	۹۳	صاحب امۃ الفاطمہ
۷۶	زایری	۹۴	صنوبر جیونی

نمبر شمار	تخلص و نام	نمبر شمار	تخلص و نام
۹۵	صدر صدر محل بیگم	۱۱۳	غریب امیر النساء
۹۶	صنم درگا بائی	۱۱۴	فرحت فرحت بخش
۹۷	ضرورت شریف النساء	۱۱۵	فنا فنات النساء
۹۸	ضیائی ضیائی بیگم	۱۱۶	فاطمہ بی بی فاطمہ سام
۹۹	طلب	۱۱۷	فاطمہ بیگم ثانی
۱۰۰	ظرافت	۱۱۸	فریدن
۱۰۱	عالم بادشاہ محل	۱۱۹	فرخ
۱۰۲	عزت عزت النساء	۱۲۰	قمر قمر النساء
۱۰۳	عائشہ	۱۲۱	قادری
۱۰۳	عصمتی	۱۲۲	قمر حیدری بیگم
۱۰۵	عصمتی ثانی	۱۲۳	کنیز منجھو خانم
۱۰۶	عصمتی جہاں آراء بیگم	۱۲۴	کمن
۱۰۷	عشرت عشرت محل	۱۲۵	کیفی
۱۰۸	عفتی	۱۲۶	کنیز کنیز فاطمہ
۱۱۹	عزیز	۱۲۷	گنا ، گنا بیگم
۱۱۰	عصمت عصمت النساء	۱۲۸	گوہر کابلی
۱۱۱	عفت نجم النساء	۱۲۹	گوہر لعل بے بہا
۱۱۲	عیدو	۱۳۰	گوہر

نمبر شمار	تخلص و نام	نمبر شمار	تخلص و نام
۱۳۱	گیتی آراء	۱۴۹	ناز بندی جان
۱۳۲	لطیف لطیف النساء	۱۵۰	نازک زینت جان
۱۳۳	ماہ منجھلی بیگم	۱۵۱	نازک فتن
۱۳۴	ماہ ثانی	۱۵۲	ناز امیر جان
۱۳۵	مخفی فریب النساء	۱۵۳	ناز
۱۳۶	مشتری قمر جان	۱۵۴	ناز بیجان
۱۳۷	ماہِ لقا	۱۵۵	نزاکت رجو
۱۳۸	محبوب محبوب محل بیگم	۱۵۶	نور جہاں بیگم
۱۳۹	مخفی سلطان جہاں بیگم	۱۵۷	نہانی
۱۴۰	معشوق حیدری خانم	۱۵۸	نسائی
۱۴۱	مغل بی بی جان	۱۵۹	نہانی بیگم
۱۴۲	منو	۱۶۰	نہانی
۱۴۳	مہتاب	۱۶۱	نہانی
۱۴۴	مہر جینا جان	۱۶۲	نجبین
۱۴۵	مدینہ مدینہ مغلانی	۱۶۳	نجبین ثانی
۱۴۶	محترم	۱۶۴	نزاکت کندو
۱۴۷	مہری	۱۶۵	نزاکت
۱۴۸	نقاب حمیدن بائی	۱۶۶	وزیر وزیر جان

نمبر شمار	تخلص و نام	نمبر شمار	تخلص و نام
۱۶۷	وزیر وزیرالنساء		
۱۶۸	ہمدی شریفہ بانو		
۱۶۹	یاسمین		
۱۷۰	یاد		
۱۷۱	یاس آفتاب بیگم		
۱۷۲	یاسمین تومن		

چمن انداز

مصنف:

درگا پرشاد نادر کھتری دہلوی۔ اپنے زمانے کے مشہور لکھنے والے تھے اور اس تذکرہ سے قبل وہ مندرجہ ذیل کتابیں لکھ چکے تھے۔

۱۔ رسالہ معیشت چمن

۲۔ معلم المبتدی

۳۔ لبِ لباب قصہ ممتاز صنف شکن

۴۔ شجرۂ غیرت گلزار یعنی نسب نامہ تیمور

۵۔ تذکرہ نادر الاذکار شعرائے دکن

نادر کو سوانح اور تذکرہ نگاری سے خاص دلچسپی تھی۔ انہوں نے دکنی شعراء کے تذکرے کے علاوہ ''گلشنِ ناز'' اور ''چمن انداز'' یادگار چھوڑے ہیں۔

عہد تصنیف وطباعت:

نادر نے تذکرہ کے خاتمہ پر لکھا ہے کہ:

''یہ گلدستہ رشک صد بہار باہزار زیب و زینت حسب تمنائے احبا، مرتب ہوا چونکہ اس میں مستورات کی خیال بندیاں ہیں۔ اس کا نام تاریخی ''مراتِ خیالی'' رکھا گیا۔

''مرات خیالی، سے اس کا سال تصنیف ۷۷۔۱۸۷۶ء نکلتا ہے۔ ''مراتِ خیالی'' دو حصوں پر مشتمل ہے

۱۔ گلشن ناز۔ فارسی گو شاعرات کا تذکرہ ہے اور ''چمن انداز'' سے پہلے ۱۲۹۳ھ میں مرتب ہوا ہے۔ اس میں ۵۴ شاعرات کا ذکر ہے۔

۲۔ چمن انداز۔ ریختہ گو شاعرات کا تذکرہ ۱۲۹۴ھ میں مکمل ہوا ہے۔

دونوں کا ملا کر نادر نے اس کا نام ''تذکرہ النسائے نادری الموسوم باسم تاریخی ''مرات خیالی'' رکھا تھا۔ یہ تذکرہ اسی نام سے ۱۸۷۸ء میں مطبع فوق کاشی دہلی سے باہتمام دیبی پرشاد پہلی بار شائع ہوا۔ گلشنِ ناز اور ''چمن انداز'' الگ الگ بھی شائع ہوئے۔ ان کے مطبوعے نسخے انجمن ترقی اردو کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

خصوصیات:

تذکرہ اردو زبان میں ہے اور ''شاعرات'' کیلئے مخصوص ہے۔ ''چمن انداز'' گلشن بے خار، بہارستان ناز، اور گلستانِ بے خزاں سے خصوصاً مدد لی گئی ہے۔ اس لئے کہ ان کا تذکرہ مصنف نے دیباچہ میں کیا ہے۔ اس تذکرہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مصنف، گلشن بے خار اور مصنف گلستان بے خزاں کی چشمک میں دہلوی ہونے کی حیثیت سے شیفتہ کے طرفداروں میں تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں

> ''حکیم میر قطب الدین باطن نے بہ جواب تذکرہ گلشن بے خار، گلشن بے خزاں چھپوایا جس کا مختصر جواب الجواب مسمی بہ ''ارمغان'' منجانب شعرائے دہلی میرے ایک دوست نے چھپوا کر حکیم صاحب کی خدمت میں ارسال فرمایا۔ مگر اکبر آباد سے صدائے برنخاست کا معاملہ پیش آیا''۔

چنانچہ سوانح اور انتخاب اشعار کے علاوہ اس کا تفصیلی مطالعہ، معاصرانہ واقعات و حالات کو سمجھنے میں بھی مدد دیتا ہے نادر نے تذکرہ میں کسی نہ کسی بہانے، علم وفن کے بعض مسائل بھی چھیڑ دیئے ہیں اور اپنی وسعت معلومات وفنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن انہوں نے فن تاریخ گوئی کے سلسلے میں ایک طویل اور جامع بحث قلمبند کی ہے۔

لیکن حالات زندگی اس تذکرے میں بھی بہت مختصر ہیں۔ انتخاب کلام بھی مختصر ہے پھر بھی اس کی تاریخی اہمیت مسلم ہے۔

فہرست شاعرات

نمبر شمار	تخلص و نام	نمبر شمار	تخلص و نام
۱	آرائش	۱۱	بستی
۲	اچپل ہنگن جان	۱۲	بسم اللہ
۳	اختر نواب اختر محل	۱۳	بنو
۴	امیر امیر بیگم	۱۴	بہو بہو بیگم
۵	اشک امراؤ جان	۱۵	بیگم بنت میر محمد تقی
۶	امراؤ جان	۱۶	تارا بیگم
۷	امراؤ حسینی بیگم	۱۷	بیگم رشک محل
۸	امراؤ جان بنت امیر خاں	۱۸	پارسا بنت نواب مرزا تقی ہوس
۹	امیر	۱۹	پٹہ باز
۱۰	امیر لکھنوی	۲۰	تسلی

نمبر شمار	تخلص و نام	نمبر شمار	تخلص و نام
۲۱	تصویر	۳۹	حجاب نواب بیگم عرف چھوٹی بیگم
۲۲	بھبولی	۴۰	حسن وزیر جان
۲۳	ثریا بڑی بیگم	۴۱	حشمت مہر جان
۲۴	ثناء	۴۲	حور بستی بیگم
۲۵	جان صاحب جان	۴۳	حور منا جان
۲۶	جانی بیگم جان	۴۴	حیا حیات النساء بیگم
۲۷	جعفری عارفہ کاملہ بیگم	۴۵	حیا
۲۸	جمعیت	۴۶	حیدری
۲۹	جینا جینا بیگم	۴۷	خاکساری
۳۰	چندا	۴۸	خفی بادشاہ بیگم
۳۱	چھوٹے صاحب	۴۹	خورشید
۳۲	حاتم	۵۰	دلبر چھوٹی بیگم
۳۳	حبیب	۵۱	دلہن دلہن بیگم
۳۴	حجاب	۵۲	ذہب مہربان
۳۵	حجاب بنی جان	۵۳	ذلیل
۳۶	حجاب عسکری بیگم	۵۴	زادیہ
۳۷	حجاب	۵۵	زہرہ نصیبن
۳۸	حجاب	۵۶	زہرہ

نمبر شمار	تخلص و نام	
۵۷	زہرہ	منی جان
۵۸	زہرہ	لطیفن
۵۹	زہرہ	امراؤ جان
۶۰	زینت	
۶۱	ژاژ	
۶۲	سردار	سردار بیگم
۶۳	سلطان	سلطان بیگم
۶۴	شرارت	امیر جان
۶۵	شرفن	
۶۶	شرم	چھوٹے صاحب
۶۷	شرم	شمس النساء
۶۸	شریر	جگن
۶۹	شوخ	گنا بیگم
۷۰	شیریں	بیگا
۷۱	شیریں	شاہجہاں بیگم
۷۲	شیریں	شیریں وحید
۷۳	صاحب	امت الفاطمہ
۷۴	صدر	صدر محل
۷۵	صنم	درگا
۷۶	صنوبر	جیونی
۷۷	ضرورت	شرف النساء
۷۸	ضیا	ضیائی بیگم
۷۹	طلب	
۸۰	ظرافت	
۸۱	عابد	نواب امراؤ جان
۸۲	عالم	عزت النساء
۸۳	عزیز	
۸۴	عشرت	نواب عشرت محل
۸۵	عصمت	
۸۶	عفت	نجم النساء
۸۷	علی	
۸۸	عیدو	
۸۹	غریب	امیر النساء
۹۰	فاطمہ بیگم	
۹۱	فاطمہ	فاطمہ سلطان
۹۲	فرحت	

نمبر شمار	تخلص و نام	نمبر شمار	تخلص و نام
۹۳	فرخ فرخ بخش	۱۱۱	مبارک
۹۴	فریدن	۱۱۲	محبوب نواب محبوب محل
۹۵	قادری	۱۱۳	مخفی سلطان جہاں بیگم
۹۶	قمر حیدری بیگم	۱۱۴	مشتری منجھو قمر جان
۹۷	قمر قمر النساء	۱۱۵	معشوق حیدری خانم
۹۸	کمن	۱۱۶	مغل مغل جان
۹۹	کنیز فاطمہ بیگم	۱۱۷	منور منور بخش
۱۰۰	کنیز منجھو خانم	۱۱۸	متو متو جان
۱۰۱	کیفی	۱۱۹	مہتاب
۱۰۲	گنا	۱۲۰	مہر جیتا خان
۱۰۳	گوہر	۱۲۱	ناز بے خان
۱۰۳	گوہر لعل بے بہا	۱۲۲	ناز
۱۰۵	گیتارا	۱۲۳	ناز
۱۰۶	لطیف لطیف النساء	۱۲۴	ناز امیر جاں
۱۰۷	لطیف	۱۲۵	نازک زینت جان
۱۰۸	لعلن	۱۲۶	نازک فتن جان
۱۱۹	ماہ منجھلی بیگم	۱۲۷	نجیبن
۱۱۰	ماہ ماہ لقا	۱۲۸	نجیبن

نمبر شمار	تخلص و نام	نمبر شمار	تخلص و نام
۱۲۹	نزاکت رجو		
۱۳۰	نزاکت کندو		
۱۳۱	نزاکت		
۱۳۲	نسائی		
۱۳۳	نظیر		
۱۳۴	نورن		
۱۳۵	وزیر		
۱۳۶	ولایتی		
۱۳۷	ہوس		
۱۳۸	یاد		
۱۳۹	یاس آفتاب بیگم		
۱۴۰	یاسمین چنبیلی		
۱۴۱	یاسمین تومن		

الوقار پبلی کیشنز
335-K2 Wapda Town, Lahore.